اسد اللہ خان
غالب
کائنات میں انسان کا مقام
مبشر حسن

غالب
کائنات میں انسان کا مقام

مبشر حسن

کتاب	غالب، کائنات میں انسان کا مقام
مصنف	ڈاکٹر مبشر حسن
صفحات	67 + xli
پہلا ایڈیشن	2005ء
تعداد	1000
سرورق	فرجود رضوی
طابع	لائن پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ
	12-بی ہسپتال روڈ، لاہور
ناشرین	بابر علی فاؤنڈیشن، معرفت پیکیجز لمیٹڈ
	لاہور، پاکستان
قیمت	200روپے
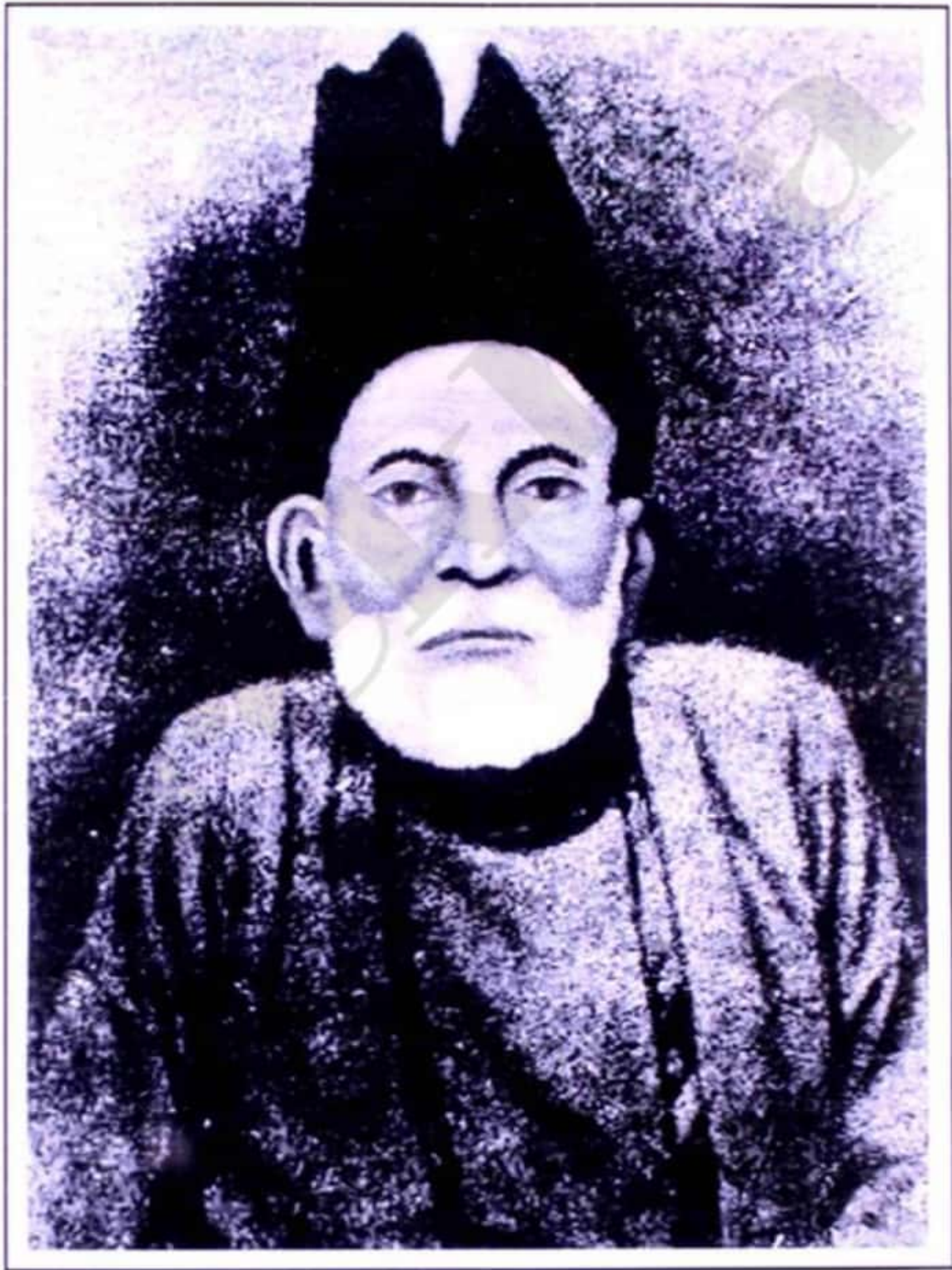
مرزا غالب کی آخری تصویر

کلاں محل آگرہ :- جائے ولادت مرزا غالب

شعر غالب نبود وحی و نگوئیم ولے
تو و یزداں، نتواں گفت کہ الہامے ہست

غالب کے شعر وحی نہیں ہیں، اور ہم یہ کہتے بھی نہیں کہ یہ وحی ہیں۔ لیکن تجھے یزداں کی قسم کیا یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ الہام ہے۔

کردہ ام ایمان خود را دست مزد خویشتن
می تراشم پیکر از سنگ و عبادت می کنم

میں نے ایمان کو اپنی محنت کی مزدوری (اُجرت) بنا لیا ہے، خود ہی پتھر تراشتا ہوں اور پھر جو تراشا ہے اس کی عبادت کرتا ہوں ۔ جیسے کوئی سنگ تراش بت تراشتا رہے تراشتا رہے اور پھر اپنی محنت کے نتیجہ کو اعلےٰ مقام دے ۔ اسی طرح میں ہوں ۔ اپنی تلاش میں بیاباں نوردی کر رہا ہوں اور اس محنت کے عوض جو بھی حاصل ہو وہی میرا ایمان ہے ۔ یعنی ہر لحظہ ایمان کی تلاش میں ہوں ۔ اصل کی تلاش میں کامیابیاں میرا ایمان بنتی جاتی ہیں ۔

ترتیب

حرفِ آغاز

ڈاکٹر مبشر حسن کو جب اپنے عہد میں آدمی اور انسان کے درمیان معرکوں میں انسانی عظمت کے فقدان کا احساس ہوا تو ان کے فکری سفر نے شاہراہِ انقلاب سے ہوتے ہوئے غالب کے شعروں کے باطن کی طرف رخ موڑ لیا۔ اور انہوں نے اس عظیم انسان کو پالیا جسے وہ اپنے عہد میں تلاش کرتے رہے، جس کی توحید وجودی میں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں، دین و دنیا میں کوئی تفریق نہیں، کوئی مذہبی فرقہ واریت کا تعصب نہیں، اُس نے تو وہ رسوم ہی ترک کر دیں جو انسانوں میں تفریق پیدا کرتی ہیں، اس طرح اُس نے انسان کو ایک اعلیٰ اور ارفع مقام پر فائز کر دیا۔

تفہیمِ کلامِ غالب میں ڈاکٹر مبشر حسن کی انقلابی فکر نے ایک جدت پیدا کی اور اسے چار عنوانات میں تقسیم کر کے اُس کی تعبیر کی۔ چاروں عنوانات غالب کے مصرعوں پر مشتمل ہیں، ہر مصرع کے مفہوم کے مطابق اردو اور فارسی کلام سے شعر چنے اور اس طرح ان چاروں حصوں کو ایک ارتقائی سلسلے میں پرو دیا۔ پہلے حصے میں غالب کو اپنے مقام اور وجود کی تلاش ہے۔ دوسرے میں غالب حُسن کے اظہار اور اخفاء کے راز سے آگاہی پاتا ہے۔ تیسرے میں غالب کے عشق کی سچائی اور خلوص نے بالآخر حُسن کے سب راز کھول دیئے۔

چوتھے حصے میں اُسے ہر طرف اسی حُسنِ ازل کے جلوے دکھائی دینے لگتے ہیں، تمام امتیازات مٹ جاتے ہیں اور ایسا انسان سامنے آتا ہے جو حُسنِ ازل کے ساتھ عشق کے رشتے سے جُڑا ہوا ہے، اُس نے پیانِ وفا کو بھلایا نہیں۔ عشق کے رشتے میں جُڑے ہونے کا احساس ہی انسان کو دنیا میں اپنے مرتبے کا شعور دیتا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ ڈاکٹر مبشر حسن کی یہ کاوش غالب کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے کا موقع فراہم کرے گی۔

سید بابر علی

عرضِ مؤلف

نہ میں ادیب ہوں اور نہ شاعر۔ لٹریچر میرا مضمون نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آنکھ سے دیکھا یا پڑھا ہوا، کان سے سنا ہوا اور ناک سے سونگھا ہوا، بعض اوقات اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ کچھ لمحوں کے لئے دوسرے سب خیال ذہن سے رخصت لے لیتے ہیں۔ بعض کیفیات عمر بھر یاد رہ جاتی ہیں جیسے غالب کے ذہن میں دوست کا وقتِ سفر بس گیا تھا۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تقسیم ہند سے دس سال پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں نئی نئی کھلی مِلک بار پر جب ایک ہم جماعت نے پوچھا ''تمہیں گھر کب یاد آتا ہے'' تو میں نے کھٹے کے پودوں کی ایک باڑ کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا ''جب اس میں بلبل بولتا ہے''۔ بلبل کی آواز آج بھی وہی کیفیت پیدا کرتی ہے جو بچپن میں کرتی تھی اور جو اس وقت کی یادوں سے منسلک ہے۔ اسی طرح سندھ میں نگر پارکر کے علاقہ میں جب پہلی بار کچھ کے رن پر نظر ڈالی تو زمین اور آسمان کی وسعت کے نظارے نے ششدر کر دیا۔ وہ تاثر آج بھی پہلے دن کی طرح ذہن میں موجود ہے۔ ذہن کے سوچ کا بٹن دبانے کی خواہش ہوتی ہے تو نظارہ

آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال غالب کے اشعار کا ہے۔ کالج کے زمانے سے دیوانِ غالب کا نسخہ کبھی ہاتھ کی پہنچ سے دور نہیں ہوا۔ ہر سفر میں بھی ساتھ رہتا ہے۔ اور بے وجہ نہیں۔ تیس برس سرکاری ملازمت کے دوران اور ایوب خاں کے زمانے سے لیکر آج تک آدمی اور انسان کے درمیان معرکوں میں کسی نہ کسی شکل میں شرکت رہی۔ ساتھیوں کی معیت میں اکثر مقامات آئے کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔ ایسے مشکل اوقات میں غالب کے اشعار کا مطالعہ طبعیت میں سکون اور ذہن میں ٹھہراؤ کا باعث ہوتا تھا۔

سالہا سال مطالعہ کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ کائنات اور کائنات میں انسان کے مقام کے متعلق غالب کے افکار سے واقفیت ہونی شروع ہوئی۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ دیوان کے نسخوں پر پنسل کے اتنے نشان لگے کہ ذہن میں اشعار اور ان کے مضامین کا انڈکس سا بن گیا۔ بیس پچیس برس پہلے جب سید بابر علی نے صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم کی "شرح غزلیات غالب (فارسی)" چھاپ کر فارسی نہ جاننے والوں پر احسانِ عظیم کیا تو غالب سے متعلق راقم الحروف کے ذہن کے کئی اور طبق روشن ہو گئے۔ طرح طرح کے انکشافات کا دوستوں سے تذکرہ ہوا۔ پھر خیال آیا کہ مضمون کے اعتبار سے اشعار منتخب کئے جائیں اور انہیں ایک ایسی ترتیب میں پیش کیا جائے جو ہمارے ذہن کے مطابق غالب کی فکر کی ارتقا میں ایک تسلسل کی شکل پیش کرے۔ پر یہ خیال بھی ہر لمحہ رہا کہ ایسا کرنا چھوٹا منہ اور

بڑی بات کے مترادف ہے۔

ساتھ میں یہ اعتراف کرنا بھی ضروری ہے کہ اگر صوفی صاحب فارسی کے دیوان کی شرح نہ لکھتے اور اگر سید بابر علی اسے شائع نہ کرتے اور اگر جناب محمد حنیف رامے اور آئی اے رحمن حوصلہ افزائی نہ کرتے تو ان صفحات میں پیش کی جانے والی کوشش قارئین کے سامنے نہ ہوتی۔ اس مسودہ کو کمال شفقت، مہربانی اور لگن سے محمد حنیف رامے، آئی اے رحمن، صغرا مہدی، زہرہ نقی، سیدہ حمید، مسعود قریشی، وجاہت مسعود، تنویر جہاں اور رضا کاظم نے پڑھا اور قرۃالعین حیدر نے سنا، اپنی قیمتی رائے سے نوازا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ عاطف سعید نے نہ جانے کتنی بار مسودہ ٹائپ اور دوبارہ ٹائپ کیا۔ میں ان سب خواتین و حضرات کا تہ دل سے مشکور رہوں گا۔

مبشر حسن

15 جون 2004

پیش لفظ

غالب کی شاعری نے ایک زمانے سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ اگر عبدالرحمٰن بجنوری نے دیوانِ غالب کو ایک الہامی کتاب کا درجہ دیا ہے تو عبدالرحمٰن چغتائی نے غالب کے اشعار کے اندر رنگوں کا ایک جہاں آباد دیکھا ہے اور پھر اپنی تصویروں کے ذریعے سے اہلِ نظر کو اس جہان کی سیر کرائی ہے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ ڈاکٹر مبشر حسن بھی غالب پر فریفتہ ہیں لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ غالب کے مزاج شناس اور رازدان بھی ہیں۔ شاید غالب شناسی انہیں حالی سے ورثے میں ملی ہے۔

ہماری شاعری کی تاریخ میں غالب پہلا شاعر ہے جو انسان کے درد کو محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ انسان اور خدا کے رشتے کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ جس ایک بات نے فکر و نظر کے حامل لوگوں کو نادانستہ طور پر ہر دور میں غالب کا گرویدہ بنائے رکھا ڈاکٹر مبشر حسن نے غالب کے اردو اور فارسی کلام میں غوطہ زن ہو کر اسے ڈھونڈ نکالا ہے۔ یہ ایک بات غالب کے اشعار میں ناسُفتہ موتیوں کی طرح جا بجا بکھری ہوئی تھی۔ ڈاکٹر مبشر حسن نے ان بکھرے ہوئے موتیوں کو کمال سلیقے سے ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ اور وہ ایک بات یہ ہے کہ نہ انسان ہی خُدا سے جُدا ہے اور نہ خُدا ہی سے انسان سے جُدا ہے۔

میری دانست میں یہی وہ ایک بات ہے جس نے ڈاکٹر مبشر حسن جیسے انقلابی مفکر کو کلامِ غالب کی تہ تک اُترنے کی ترغیب دی۔ آج ہماری سیاست، معیشت اور

ثقافت میں انسان کو بہت پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ غالب نے خُدا کی خُدائی میں انسان کو جو مرکزی کردار دیا تھا اُس پر وقت کی گرد نے اچھی خاصی تہ جما دی تھی۔ ڈاکٹر مبشر حسن نے اس گرد کو جھاڑ کر انسان کے عشق اور خُدا کے حُسن کی وحدت کو بے نقاب کر دیا ہے اور یوں دنیائے ادب میں بھی ایک انقلابی معرکہ سَر کر ڈالا ہے۔

محمد حنیف رامے

غالب

کہا جاتا ہے کہ غالب کا جتنی بار مطالعہ کیا جائے اس کے اشعار کے نئے نئے مطالب ذہن میں آنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا دارومدار پڑھنے والے کے تجربہ میں وسعت اور اس کی افتادِ طبع کے محرکات میں تبدیلی پر ہے۔ لیکن ڈاکٹر مبشر حسن کے لیے غالب کی طرف مراجعت کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے ممدوح کی طرح ایک زوال پذیر معاشرے کے بحران سے نمٹنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

غالب کا دور برصغیر کے مسلمانوں کے لیے انتہائی ہولناک بلکہ مہلک گراوٹ کا زمانہ تھا اور غالب ان گنے چنے افراد میں سے تھا جو اس عمل کو ایک تہذیبی کشمکش کی صورت میں شناخت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ہندوستان کا جاگیردارانہ معاشرہ اپنے ارتقاء کے تقاضوں سے غافل تو تھا ہی اس نے نئی تہذیب سے اختلاط کو ایک ٹکراؤ کا رنگ دے دیا۔ اس نئی تہذیب کے سامنے ہندوستان کے بالائی طبقات کی پسپائی کی بنیادی وجہ غالب کی نظر میں ایسی رسوم و قیود کی پابندی تھی جو مردہ ملتوں کا ترکہ تھا۔ شاعر کی نظر میں فرہاد بھی اپنے مرنے کے لیے گھسی پٹی رسم کا اتباع کر کے بدنام ہوا۔

آج کی زبان میں رسوم و قیود زیادہ تر محدود معنی میں استعمال کئے جاتے

ہیں، لیکن غالب کی زبان میں ان سے مراد پورا نظام ہے۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغلیہ حکومت کے بانیوں کے بنائے ہوئے سماج کا تانا بانا انیسویں صدی کے وسط تک مہمل ہو چکا تھا۔

جس صورتحال سے ڈاکٹر مبشر حسن دو چار ہیں وہ غالب کے دور سے زیادہ سنگین نظر آتی ہے۔ غالب کے معاصرین کی ابھرتی ہوئی تہذیب کے بارے میں معلومات واجبی تھیں۔ ان کا مقابلہ ایسی قوت سے تھا جسے وہ صحیح طور پر پہچانتے بھی نہ تھے۔ بہت سی نئی اقدار کو انہوں نے بلا وجہ حریف کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ ڈاکٹر مبشر حسن کی مشکل یہ ہے کہ ان کا معاشرہ دوراز کار رسوم و قیود اختیار کرنا چاہتا ہے، جبکہ اسے مستقبل کی قوتوں کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہیں اور اس کے لیے بقاء اور ترقی کے نئے ذرائع اختیار کرنے میں علاوہ کور بینی کے کوئی اور رکاوٹ حائل نہیں۔ یہ کور بینی ہی کا کرشمہ ہے کہ انسان عقل کے بجائے فرسودہ عقیدہ پر تکیہ کرے۔

ایک معاملہ میں غالب ڈاکٹر مبشر حسن کے مقابل میں خوش قسمت تھا کہ رند شاہد باز کے مقابلہ میں علامہ نہیں ہوتے تھے۔ کسی نے بہت مرتبہ پایا تو مولوی یا مولانا کہلایا اور شاہ ولی اللہ کو تو کسی نے عام گفتگو میں ان القابات سے بھی نہیں نوازا۔ چنانچہ غالب کی بحث یا زاہد سے ہوتی ہے یا واعظ سے۔ اور یہ دونوں تراکیب بالکل صحیح ہیں۔ غالب واعظ کو ناصح سے زیادہ درجہ نہیں دیتا جبکہ زاہد کی عملی زندگی کا اعتراف واضح ہے۔ بہرحال وہ واعظ اور زاہد دونوں اور ان کے

سب ہی ماننے والوں کو معاملات کو وسیع ترین تناظر میں دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

ایک طرف وہ قطرہ میں دجلہ دیکھنے کی دعوت دیتا ہے اور دوسری طرف افلاک اور صحرا اِک نقشِ پا سے زیادہ وسیع نہیں۔ زمان و مکان کے اس وسیع تناظر میں نت نئے عقیدہ کی تلاش غالب کی نظر میں محدود سلامتی کی خواہش سے زیادہ نہیں۔ اس لیے وہ بار بار انسانوں کو خود شناسی کے ذریعہ زیادہ مستقل تسکین کا راستہ دکھاتا ہے۔

میرے خیال میں جو بات ڈاکٹر مبشر حسن کو غالب کی طرف کھینچتی ہے وہ غالب کے ذہن میں انسان کا مرکزی کردار ہے۔

جب بھی غالب اپنے ہونے سے پہلے کی حالت کا ذکر کرتا ہے یا شاہد و مشہود کا رشتہ واضح کرتا ہے تو وہ کائنات میں اپنے تخلیقی کردار پر گرہ لگاتا ہے۔ یعنی انسان صرف کائناتی قوتوں کا شکار نہیں ہے بلکہ ان قوتوں پر اقتدار حاصل کر کے کائنات کا نقشہ بدلنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اب اگر سارے نظام کا مرکزی کردار انسان کو مان لیا جائے اور اسے عقیدے اور رسوم و قیود کے بندھنوں میں جکڑنے کے بجائے ہوائے سر رہگزار کی مدد سے راستہ بنانے کی مہلت دی جائے تو وہ اپنا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے یہ ضرور ہے کہ اسے اپنے پندار کے صنم کدہ کو ویراں کر کے کوچہ ملامت میں آنا پڑے گا۔

ڈاکٹر مبشر حسن تو خاصے عرصہ سے کوئے ملامت کا طواف کر رہے

ہیں۔ غالب کے اشعار کی کہانی انہوں نے دوسرے شرفاء کو اس حسین کوچہ میں کھینچنے کے لیے بیان کی ہے۔ یہ کام ایسا مشکل بھی نہیں ہے۔ کیونکہ غالب ہی نے کہا ہے کہ

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے

انقلاب لانے کی صلاحیت یا توفیق صرف اُنہی کو حاصل ہوتی ہے جو انقلاب لانے پر کمربستہ ہو جائیں۔

آئی۔اے۔رحمٰن

تعارف

آج غالب کا مطالعہ کیوں ضروری ہے؟

☆ اس لئے کہ غالب کی نظر میں انسان کائنات میں اپنا مقام ڈھونڈنے اور اپنی حیثیت دریافت کرنے کا شعور رکھتا ہے۔

انہوں نے اپنا مقام دریافت کرلیا تھا۔ فرماتے ہیں۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے
کاش کہ پرے ہوتا عرش سے مکاں اپنا

وہ جہاں پہنچ گئے تھے اس سے اور بلند ہونا ممکن نہیں تھا۔ یہ تو تھے غالب جن کا کائنات کو دیکھنے اور سمجھنے کا مقام عرش جتنا بلند تھا۔ ادھر ہم ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر گھٹیا ترین احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ اپنے آپ کو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ ہر ایک کے سامنے جھکنے کو تیار ہیں۔ ہمارا اپنا کوئی نظریہ نہیں ہے، ہمارے سامنے کوئی سچائی نہیں ہے، جس پر قائم رہیں۔ یا اس کے لئے کوئی قربانی دینے کو تیار ہوں۔ ہم نہ اپنی عزت کرتے ہیں نہ کرواتے ہیں۔

☆ ایک غالب تھے جو پیاسے جان دینے کو تیار تھے، لیکن اس دریا کے پانی سے حلق تر کرنے کو تیار نہیں تھے جس پر انہیں شبہ ہو جائے کہ غالب کو دیکھ کر دریا کی لہریں دریا کے ماتھے پر شکن ڈال رہی ہیں۔ ادھر ہم ہیں جو لالچ کی خاطر اور

ہوس میں نہ صرف اپنا نام وعزت قربان کرنے کو تیار ہیں بلکہ دوسروں کے ساتھ بھی ظلم و زیادتی سے گریز نہیں کرتے۔ دولت اور مرتبہ کے لئے ہر طرح کے برے کام کو تیار رہتے ہیں۔

☆ ایک تھے غالب جو اپنے زمانے کے خوشامدیوں سے اتنے تنگ آئے کہ حسینوں کی محفل میں بھی حُسن کی داد دینے سے ہچکچانے لگے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن پر بھی خوشامدی ہونے کا شبہ ہو جائے۔

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

ادھر ہم ہیں کہ ہمارا معاشرہ خوشامدیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ترقی اور دولت کے دروازے کھولنے کے لئے خوشامد کی چابی خوب استعمال کی جاتی ہے۔

☆ منافقت اور موقع پرستی دیکھ کر غالب کا جی جلتا تھا۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

ہم ہیں کہ دنیا میں آگے بڑھنے کے لئے منافقت اور موقع پرستی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔

☆ غالب فکری آزادی کے علمبردار تھے۔ منصور حلاج سے اختلاف کرتے تھے لیکن اس کی گردن زدنی کو غلط قرار دیتے تھے۔ آج ہمارے بھی منصور کے زمانے جیسے حالات ہیں۔ بات بات پر ہم لوگ ہر کسی کو ریاست کا غدار یا دین

سے مرتد قرار دے کر اسے سخت سے سخت سزا دینے کو تیار ہیں۔

☆ غالب کو ہر مذہب میں جلوہ ہائے حق نظر آتے تھے۔ ادھر ہم ہیں کہ طرح طرح کے مذہبی و فرقہ وارانہ تعصب کا شکار ہیں۔ مذہب اور فرقہ کے نام پر ایک دوسرے کو مارتے کاٹتے رہتے ہیں۔ عبادت گاہوں پر گولیاں چلاتے اور بم مارتے ہیں۔

☆ آج کے زمانے کے بھلے آدمیوں کی طرح غالب کو بھی شکایت تھی کہ زمانہ نیکی کا بدلہ بدی سے دیتا ہے۔

کہوں کیا خوبیٔ اوضاع ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے، جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

طنز کے طور پر فرماتے ہیں کہ اہلِ دنیا کے طرزِ عمل کی کیا کیا خوبیاں بیان کروں، ہم نے تو جس کے ساتھ بار بار نیکی کی اُس نے بھی ہمیں بدی ہی میں صلہ دیا۔ اہلِ دنیا کے رویہ سے اتنے نالاں ہوئے کہ فرمایا

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

یعنی جس طرح کتے کا کاٹا آدمی ڈر کے مارے پانی کے قریب نہیں جاتا، اس طرح ہم دنیا والوں سے ڈرتے ہیں۔ سوچتے تھے:

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار کا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

غالب کا پیغام تھا کہ حالات کی شکایت نہ کرو، اور ہمت نہ چھوڑو۔ اگر تم اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو اور تمہاری ہمت ٹوٹ رہی ہے اور حوصلہ کم ہو رہا ہے تو اس پر شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

معاشرہ کا تو آوا کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ بنیاد بھی غلط ہے اور اٹھان بھی۔ اس سے تو عبرت بھی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس معاشرہ سے حاصل کیا ہوا سبق بھی صحیح نہیں ہوگا۔ لہٰذا حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اپنا اور ہی راستہ تلاش کرو۔

☆ ☆ ☆

غالب کے زمانے سے لیکر آج تک کے ڈیڑھ سو برس میں سوشل سائنس

کے علوم میں بہت ترقی ہوئی ہے۔ معاشرہ کو سمجھنے اور اس میں تبدیلی لانے کے لئے بات فرد سے بڑھ کر جماعت اور طبقہ تک جا پہنچی ہے۔ مفادات کے ٹکراؤ کی نوعیت شخصی، خاندانی یا قبائلی نہیں رہی۔ لیکن آج بھی فرد کے علم، خلوص، لگن اور کیریکٹر کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔ ثقہ افراد کی آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی غالب کے زمانہ میں تھی، آدمی اور انسان کا فرق آج بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ غالب کے زمانے میں تھا۔ وہ واعظوں، ناصحوں اور زاہدوں کی بتائی ہوئی راہ کو غلط سمجھتے تھے۔ وہ اپنی راہ خود تلاش کرنا چاہتے تھے۔ آج کے حالات کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ ایسے زمانوں میں حساس طبیعتیں روشنی کی تلاش میں نکل پڑتی ہیں۔ کوئی سالہا سال دن رات عبادت کر کے، کوئی ترک دنیا کر کے، کوئی بیابانوں اور جنگلوں میں لو لگا کر دانائی اور بزرگی کی اعلےٰ منزل تک پہنچا ہے۔ غالب نے بھی اپنی زندگی ایسی ہی تلاش کے لئے وقف کر دی تھی۔ انہوں نے بھی اور ولیوں، رشیوں کی طرح اپنی منزل پالی تھی۔ اپنا نظریہ کائنات وضع کیا تھا۔

غالب نے کائنات کے متعلق اور کائنات میں اپنے مقام کے متعلق جو رائے قائم کی وہ اس کی تشہیر کے قائل نہیں تھے۔ انہیں منصور حلاّج سے بھی گلہ تھا کہ آخر اس نے اناالحق کا نعرہ کیوں بلند کیا۔ وہ خاموش کیوں نہیں رہا۔

خاموشی سے اپنے کو واضح کرنے کا طریقہ غالب نے شاید اس لئے اپنایا ہو کہ غالب کی سوچ کی منطق عام آدمی کی سوچ کی منطق سے الگ تھی۔ وہ اُلٹ

طرح کے مشاہدات یا صفات یکجا ہو کر ان کی فکر میں ایک تخلیقی لہر پیدا کر دیتے تھے ۔ نتیجہ دونوں تضادات پر حاوی ہو جاتا تھا ۔ مثلاً

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

خزاں اور سردی کے موسم میں چمن کیا ہے؟ زمین سے اُگے ہوئے کچھ پودے ہوتے ہیں اور مٹی میں دبے ہوئے بیج یا جڑیں جو الگ الگ اپنے طور پر دلکشی سے عاری ہیں ۔ اسی طرح بہار کی ہوا کیا ہے ۔ ایک خاص ٹمپریچر اور نمی کی ہوا ۔ اور اس میں بھی بطور ہوا کوئی دلکشی نہیں ہے ۔ لیکن جب بہار کی ہوا اور چمن یکجا ہوتے ہیں تو چمن چمن بن جاتا ہے ۔ اس کا حُسن جلوہ گر ہو جاتا ہے ۔ حُسن کی جلوہ گری کے لئے تضاد کا موجود ہونا ضروری ہے ۔

اسی طرح دوست کے چہرہ پر غالب بھوں اور آنکھ میں ایک تضاد دیکھتے ۔ وہ بھوں کو مسجد کے محراب یعنی امن اور تقدس سے تشبیہ دیتے ہیں ۔ لیکن آنکھ کو جس سے نکلی ہوئی نگاہ ان کو تڑپا دیتی ہے اس کو غالب خرابی سے تشبیہ دیتے ہیں ۔

شوخیٔ چشمِ حبیب، فتنۂ ایام شد

محبوب کی آنکھوں کی شوخی فتنہ ایام بن گئی لیکن کیا کریں ۔ جب تک آنکھ پر بھوں کا سایہ نہ ہو، دوست کا حُسن پوری طرح جلوہ گر نہیں ہوتا ۔ وہ اِس سے مبہوت نہیں ہوتے ۔ اسی لئے کہتے ہیں :

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

غالب ایک غزل میں ایک ایسی محفل کا نقشہ کھینچتے ہیں جہاں عابدوں اور پارساؤں کے ساتھ رند بھی موجود ہیں۔ رند رندی میں اور پارسا پارسائی میں مصروف ہیں جس سے شاعر کی فکر کے مطابق پوری محفل شہر نور بنی ہوئی ہے۔ یعنی دنیا کے بنیادی تضادات کی اس سے بہتر اور مبارک محفل جم نہیں سکتی تھی۔ بڑے بڑے دکھائی دینے والے فرق مٹ جاتے ہیں۔ اس محفل سے غالب پر دوررس انکشافات ہوتے ہیں۔ بہرحال غالب کا نظریہ کائنات جو بھی قرار دیا جائے اس کا اہم جز وامن، دوستی، صلح اور رواداری تھا۔ فرماتے ہیں

سر از حجاب تعین اگر بروں آید
چہ جلوہ ہا کہ بہ ہر کیش می تواں کردن

اگر انسان ان پردوں کو ہٹادے جو اس نے اپنی سمجھ پر ڈالے ہوئے ہیں تو کیسے کیسے جلوے ہیں جو ہر مذہب میں اسے نظر آئیں گے۔ غالب ایک طرح کے صوفی بلکہ ولی تھے۔ مسائل تصوف پر گہری نظر تھی۔

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب!
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

انہوں نے اپنے آپ کو صوفی بھی کہا:

دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی

فرماتے ہیں:

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

ان اشعار میں جو ہدایت ہے اس کا سہرا ایک ولی کے سر پر ہی سجتا ہے۔ ایک اور شعر میں فرماتے ہیں

وارستگی بہانہ، بیگانگی نہیں
اپنے سے کر، نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

ان کی نظر میں آزاد فرد بننا یعنی ہر قسم کی دنیاوی پابندیوں سے اپنے کو آزاد کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ دوسروں سے بیگانہ ہو جائے، اور قطع تعلق کر لے۔ اگر وحشت کرنی ہے یعنی اگر دوسروں سے الگ ہونے کو، دور بھاگنے کو جی چاہتا ہے تو اپنے سے کرنی چاہئے۔ یہ مسلک بھی صوفیانہ ہے۔

غالب کا نظریہ، اسے سوچ کا نتیجہ قرار دیں یا الہام، ان کے اردو اور فارسی کے دیوانوں میں بکھرا ہوا ہے۔ اس مختصر سے کتابچہ میں چیدہ چیدہ اشعار ایک خاص ترتیب سے پیش کئے جا رہے ہیں جو شاید غالب کی فکری ارتقا اور منطق کی نشاندہی کریں۔ دشوار گزار راہ ہے کیونکہ غالب تو اپنے شعر میں آنے

والے ایک ایک لفظ کو بے حد پُر معنی قرار دیتے تھے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

اے پڑھنے والے جان لے میرے اشعار میں آنے والے الفاظ محض ایک اشارہ ہیں۔ ایک ایک لفظ میں معانی کا خزانہ چھپا ہوا ہے۔ اس میں علم و فضل اور فہم و فراست کی ایک دنیا بسی ہوئی ہے۔

در نطق مسیحا دم، از خصم چہ باک است

در ناز، ز خود می رمی، از غیر چہ بیم است

میری قوت گویائی میں مسیحا کے سانس کا سا اعجاز ہے، مجھے دشمن کا کیا خوف، تو ناز میں اپنے سے بھی کھو جاتا ہے، تجھے رقیب کا کیا ڈر۔

میرے اشعار کے مضامین میرے نہیں ہیں۔ وہ میری فکر و نظر کی پیداوار نہیں ہیں۔ یہ مضامین تو غیب سے اترتے ہیں۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

غالبؔ! صریر خامہ، نوائے سروش ہے

لکھتے وقت میرے قلم سے جو آواز نکلتی ہے دراصل فرشتۂ غیبی کی آواز ہوتی ہے۔

اس کتابچہ میں اردو اور فارسی کی غزلوں سے منتخب اشعار کے ذریعہ ایک سلسلہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ایک کہانی سی بن جائے۔ کچھ رائے قائم

ہو جائے کہ اپنی فکر کے ارتقاء میں یا اپنی سوچ کے سفر میں غالب کن مقامات سے گزرے ہونگے۔ ان کے سفر کی نوعیت عارفانہ تھی۔ پورا عالم غالب کے حلقہ دام خیال میں تھا۔

☆ ☆ ☆

اس انتخاب میں غالب کے سفر کو چار منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی منزل ''آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی'' پر مشتمل ہے جس کا آغاز فارسی کے مشہور شعر سے ہوتا ہے۔

مشتِ غبار ماست پراگندہ سُو بسُو
یارب بدہر در چہ شمارِ خودیم ما

غیبی آواز غالب سے پوچھواتی ہے کہ دنیا میں تیری حیثیت کیا ہے، معلوم تو کر۔ غالب کی کھوج کا یہ بنیادی سوال بن جاتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ دریافت کرنے کی سعی میں ہیں کہ دنیا کیا ہے بلکہ یہ بھی کہ اس میں اُن کا مقام کیا ہے۔ یارب اس دنیا میں ہمارا وجود کس شمار میں ہے۔

کائنات کے متعلق رائج الوقت افکار و عقائد غالب کو قائل نہیں کر سکے تھے۔ علماء دین اور مفتیانِ شرع متین سے انہیں اختلاف ہے۔ محض جنت کے انعام یا دوزخ کے عذاب کے ڈر سے غالب کسی بات کو غلط یا صحیح تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ تو اپنا مقام ڈھونڈنے کی ایسی تلاش میں ہیں جیسے حضرت

موسیٰ کی تلاش کو وطور پر تھی۔

جلوہ، طور دیکھنے کی خواہش کے بعد کے اشعار واضح کرتے ہیں کہ غالب کی تلاش کا میدان کوئی لق و دق صحرا نہیں ہے بلکہ جہاں بھی حسن ہے غالب وہیں ڈھیر ہیں۔حسن کے جلوہ سے غالب کی جان پر بن جاتی تھی۔

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنہء شورِ قیامت، کس کی آب و گل میں ہے

غالب کے طالب علموں کے لئے شاید سب سے مشکل مرحلہ اُس کیفیت کی نوعیت کو سمجھنا ہے جو غالب پر حُسن کے جلوے سے طاری ہو جاتی تھی۔ایسا لگتا ہے کہ اس میں شاید ہی غالب کے ذہن یا خواہش کا کوئی دخل ہو۔وہ حسن کے جلوہ کے سامنے بے بس ہوتے تھے۔ان پر بیخودی طاری ہو جاتی تھی۔ہوش وحواس خیر باد کہہ جاتے تھے۔

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت
دستِ تہ سنگ آمدہ، پیمان وفا ہے

میں دوست کی الفت میں گرفتار ہونے کا دعوے کرتا ہوں، اپنے پیمان وفا کی پختگی کا اعلان کر رہا ہوں حالانکہ میری حالت اس شخص کی سی ہے جس کا ہاتھ ایک بھاری پتھر کے نیچے آیا ہوا ہو اور وہ اسے چھڑا نہ سکے۔میں جس عشق میں مبتلا ہوں اس سے نکلنا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔

غالب کی حُسن پرستی اپنے زمانہ کے اہلِ نظر کے شیوہ سے مختلف تھی۔اس

زمانہ کے اہلِ نظر یعنی مہذب اور شائستہ لوگ حُسن پرستی میں تو شامل تھے لیکن غالب کی طرح گھائل نہیں تھے۔ ان کے مقابلہ میں غالب کو اپنے عشق کی شدت پر قابو نہیں تھا۔ ان کا عشق جنون کی حد چھوتا تھا۔ وہ اس کے سامنے بے بس تھے۔ بیخود ہو جاتے تھے۔ بیخودی کی کیفیت انہیں مرغوب تھی۔ حُسن کا نظارہ ان میں بیخودی کی کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔ بیخودی ایک طرح کی منزل بن گئی۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

حسن کا نظارہ نصیب ہو تو نہایت عمدہ۔ نہ ملے تو شراب ہی مل جائے۔ لیکن اگر دونوں مل جائیں تو واہ واہ! کیا کہنے۔

اور وہ حُسن کے پیچھے کیا ہے کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔

غالب کے حساب سے بہار کے موسم میں حُسن کا پھیلاؤ دیکھ کر چاند اور سورج بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔ غالب بیچارہ تو کیا ہے۔ سبزہ وگل ہوں یا ابرو ہوا سب کا حُسن غالب کی کھوج کا مرکز ہیں۔ حسینوں کا چہرہ، سرمہ بھری آنکھیں اور پرشکن زلفیں بھی حُسن کی حقیقت کا راز نہیں کھولتیں حالانکہ جسم کا ایک ایک بال چشم بینا بنا ہوا ہے۔

☆ ☆ ☆

''پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے'' کی منزل میں شامل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کی سمجھ اور حُسن کے جلوہ کے بیچ میں ایک پردہ

حائل ہو جاتا ہے۔ حُسن کا نظارہ، نظارہ بھی ہوتا ہے۔ اور نقاب بھی بن جاتا ہے۔

جلوے اور نقاب کی گتھی غالب کے لئے بجھاؤ کا اشارہ بن جاتی ہے۔

یہاں تک کہ غالب کا عشق جنوں کی صورت اختیار کر کے صحرائے تحیّر میں پہنچ جاتا ہے۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم فرماتے ہیں: عشق و محبت کے انتہائی مقامات میں ایک مقامِ حیرت ہے کہ جہاں انسان محبوب کے تصور میں ایک ہی جگہ ٹھہر جائے یا رُک جائے۔

پھر غالب کی فکر ایک نیا مقام دریافت کرتی ہے۔ فرماتے ہیں: اے حُسن تو یہ نہ جان کہ محض تو ہی اپنے راز کا محرم ہے۔ ہمیں پتہ ہے کہ تو اپنے اوپر پردہ ڈالتا ہے۔ وہ بھی تیرے ہی حُسن کا جلوہ ہے۔ ہم تیرا سراغ اس پردہ سے لگا لیں گے۔

رفتہ رفتہ غالب کو یقین ہو جاتا ہے کہ حُسنِ دوست اپنا جلوہ دکھانے کا مشتاق ہے۔ حُسن ہی تو کائنات ہے اور ایک طرف کائنات اپنا جلوہ دکھانے کو تیار اور دوسری جانب غالب اس کے راز معلوم کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی تو نہیں ہیں؟ یہ وہ سوال ہے جو غالب کے طالب علم کے ذہن میں پیدا ہونا لازمی ہے۔

ایک رات غالب عجیب کیفیت سے گزرتے ہیں جو انہوں نے ایک غزل مسلسل میں بیان کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کی سنی گئی۔

غالب کے کان میں آواز آتی ہے کہ عالم اور عابد پر بھروسہ نہ کر۔ عالم کا وعظ فضول اور عابد کی عبادت بیکار ہیں۔ باتوں کے سوا کفر اور ایمان کہاں ہیں؟ آزاد ہو جا۔ اپنے فیصلے خود کر۔ بندگی چھوڑ دے۔ زہد و تقویٰ کی رسومات سے چھٹکارا حاصل کر۔ ہدایت ہوتی ہے کہ اپنے آپ سے آنکھیں بند کر لے۔

غالب جست لگا کر چل پڑتے ہیں۔ ہوش و خرد ان کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسی محفل میں پہنچتے ہیں جہاں عبادت گزار عبادت اور رند بوس و کنار اور مےنوشی میں غرق ہیں۔

معشوقِ بزم کی اس محفل میں اس کا حُسن اور آفاق کا فتنہ ساتھ ساتھ موجود ہوتا ہے۔ جس سے غالب اخذ کرتے ہیں کہ ایزد بھی محسوسات میں سے ہے اور عالم بھی احاطہء عقل میں ہے۔ یہ راز پا کر انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ راز کے علم کو نقاب بنا کر اپنے چہرہ پر ڈال لیا۔ غالب نے اپنی منزل پالی۔ ان کی کھوج کامیاب ہوئی۔ ان پر سب راز کھل گئے۔

''دہر جُز جلوہ یکتائی معشوق نہیں'' کی منزل کے اشعار میں غالب دین اور دنیا کے معاملات پر اپنا موقف واضح کرتے ہیں۔

ما ئیم و ذوق سجدہ چہ مسجد چہ بتکدہ
در عشق نیست کفر ز ایماں شناختن

ہمیں سجدہ کا لطف اٹھانا ہے، خواہ مسجد میں یا بتکدہ میں۔ کیونکہ عشق میں کفر و ایمان کی شناخت نہیں کی جاسکتی۔

ان کے ضمیر سے سب تفرقے مٹ چکے ہیں۔

غالب اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کائنات ایک یکتائی ہے۔ کائنات معشوق کے حُسن کا جلوہ ہے۔ معشوق خود اپنا حُسن دیکھنے کا خواہشمند ہے۔ غالب کی ذات بھی اسی کے حُسن کا حصہ ہے۔ غالب خود مشاہدہ بھی ہیں اور مشاہدہ کرنے والے بھی، تو ہم اپنی اصل دریافت کرنے کی کوشش میں ہی تو ہیں۔

غالب زاہدانہ طرز زندگی کے خلاف ہوگئے۔

فرماتے ہیں: مختصر بات یہ کہ دوسروں کی طرح میرا دل بھی زہد و تقویٰ کی طرف مائل ہے۔ لیکن زاہد کے ناہنجار اطوار دیکھ کر میں نے کافرانہ طرز عمل اختیار کر لیا ہے کہ یہ غلط زاہدانہ کردار سے بہتر ہے، ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

جب زاہد کو اپنی زندگی میں بربادی اور تباہی کی صورت نظر آئی تو اس نے بندگی اور اطاعت کا شیوہ اختیار کرلیا۔ زمانہ کے نظام کو قبول کرلیا۔ گویا اس کے گھر کی جھکی ہوئی دیواریں اس کے لئے محراب بن گئیں، مقدس ہوگئیں۔

☆ ☆ ☆

آخری منزل کے اشعار غالب کے موحد بن جانے سے متعلق ہیں۔ انہوں نے ترکِ رسوم شروع کر دی۔ ایک ایک کر کے مروجہ رسومات و اقدار کے لبادے اتارنے شروع کئے۔ طاعت و زہد چھوڑا، بادہ خواری اختیار کی۔ دنیا یعنی مروجہ اقدار کے پیروکاروں کی نظر میں قابلِ تنقید و مذمت ہو گئے۔ ان اقدار سے روگردانی ان کی شخصیت بن گئی۔ ہر طرح سے بدنام ہو گئے۔
غالب پر بہت لعن طعن ہوئی۔ کسی نے رافضی کہا تو کسی نے دہریہ اور کسی نے آتش پرست۔

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

مایوس ہو جاتے ہیں۔ نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں۔ جہاں بھی ہوں وہ جگہ راس نہیں ہے۔ اگر پھول ہوں تو کانٹوں میں گھرا ہوا ہوں اور اگر خس و خاشاک ہوں تو میرے اردگرد پھول ہیں۔ فرماتے ہیں:
تیری تلاش میں ہم عقل سے بھی گئے اور دین سے بھی گئے۔ ہم نے اپنا دل بھی دے دیا اور جان بھی۔ البتہ جو تو ہم سے نہیں چھین سکا وہ خبر ہے۔ دنیا میں رہنے کے باوجود ہم ایسی منزل کی جانب نہیں جائیںگے جہاں ہماری فکری آزادی اور خودداری کو ٹھیس پہنچے۔ یہاں تک کہ جس کی پرستش کریں اس کا در بھی ہمارے لئے کھلا ہونا چاہیے۔ ہمیں بڑے سے بڑے در پر دستک دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہم تو کتنے بھی پیاسے ہوں اگر دریا کے پانی کی لہر پر ہمیں شبہ ہو جائے کہ لہر یں دریا کی پیشانی پر بل ہیں تو ہم اس پانی سے حلق تر نہ کریں۔ پیاسے ہی جان دے دیں۔

غالب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آدمی اور انسان جدا جدا ہیں۔ ہر کس و ناکس آدمی تو ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس میں انسانیت بھی ہو۔ آدمی کا انسان بنا لگتا تو آسان ہے لیکن یہ بہت دشوار ہوتا ہے۔ اس کے لئے انا الصنم یعنی ''میں پتھر ہوں میں کچھ بھی نہیں ہوں'' کا نعرہ لگانا پڑتا ہے۔ اپنے آپ سے آنکھیں بند کرنی پڑتی ہیں۔

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

غالب کسی تلاش میں ہیں۔ کس تلاش میں ہیں یہ پوری طرح واضح نہیں ہے۔ البتہ ارادہ پکا ہے۔ جی میں کچھ ٹھانا ہوا ہے۔

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

ہماری زندگی کے جتنے دن بھی باقی رہ گئے ہیں ہم اپنے پکے ارادے پر قائم رہیں گے۔ تلاش جاری رکھیں گے۔
لفظ ''اور'' بتاتا ہے کہ غالب نے کچھ اور ہی ٹھانی ہے یعنی جو کچھ ٹھانی ہے وہ عوام اور خواص کے مروجہ مقاصد و منازل سے مختلف ہے۔

غالب کو دنیا میں اپنا مقام اور وجود معلوم کرنے کی جستجو ہے۔ ایک فکر لاحق ہے۔ ذہن پر بے شمار سوالات کا دباؤ ہے۔

مشتِ غبار ماست پراگندہ سُو بسُو
یارب بدہر در چہ شمارِ خودیم ما

ہمارا وجود ایک مشتِ غبار ہے، جو ہر طرف بکھرا ہوا ہے۔ ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ اس دنیا میں ہماری کیا حیثیت ہے۔ ہم کیا ہیں۔ ہم اپنے آپ کو

کہاں شمار کریں۔ جب تک ہمیں اپنے مقام کا پتہ نہ ہوگا ہم کیسے فیصلہ کریں گے کہ دنیا میں کیا صحیح ہے، کیا غلط ہے، کیا اعلے ہے، کیا ادنے ہے، کیا خوبصورت ہے اور کیا بدصورت ہے۔

غالب کو اپنے زمانے کے ان واعظوں اور ناصحوں سے اختلاف ہے جو جنت میں داخلہ کا لالچ دے کر نیکی کی راہ پر چلنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ اس بحث میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ فرماتے ہیں

درگرم روی سایہ و سر چشمہ نہ جوئیم
باما سخن از طوبےٰ و کوثر نتواں گفت

ہمیں جلدی ہے۔ ہم کسی تلاش میں ہیں۔ ہمارے پاس اس بحث کے لئے وقت نہیں ہے کہ اگر تمہاری بتلائی ہوئی نیک راہ پر چلیں گے تو کس طرح مرنے کے بعد ہم جنت میں طوبےٰ کے پیڑ کے سائے تلے آرام کریں گے اور کس طرح کوثر کے چشمہ سے سیراب ہونگے۔

ہم سے اس کی بات نہ کرو۔ ہمارے لئے طوبے کے سائے اور کوثر کے چشمے کے لئے زندگی بسر کرنے کی منطق کافی نہیں ہے۔ اس سے ہماری تسلی نہیں ہوتی۔

یا تمنائے من از خلد بریں نہ گزشتے
یا خود امید گہے در خور آں می بایست

یا تو میری تمنا خلد بریں سے آگے نہ جاتی، یا پھر اس بلند تمنا کے مناسب کوئی بلند امید گاہ ہونی چاہیے تھی۔ اُسی کی تلاش میں ہیں۔ مل نہیں رہی۔
ہم اسی کے لیے سرگرداں ہیں۔ نہیں ملی تو کیا ہوا۔

غالب کی تلاش کی نوعیت ذاتی نہیں ہے۔ اُنہیں مال و دولت، جاہ و حشم، سلطنت، اقتدار یا آبِ حیات کی تلاش نہیں ہے۔ غالب ڈھونڈتے ہیں کہ سچ کیا ہے، انصاف کیا ہے، انسانیت کیا ہے۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

غالب کی تلاش کا درجہ پیغمبرانہ ہے۔ وہ پوری طرح اپنے کو اس تلاش کا اہل سمجھتے ہیں۔ اپنے آپ سے کہتے ہیں کہ آؤ ہم بھی چلیں۔ حضرت موسےٰ جا سکتے تھے تو غالب بھی جا سکتے ہیں۔ موسےٰ تو وہ نہ دیکھ سکے جو دیکھنا چاہتے تھے۔ شاید ہم وہ پالیں جو وہ نہ پا سکے۔ ہم بھی اپنے آپ کو آزمالیں۔ اس میں کوئی مضائقہ تو نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

موسےٰ کو تو اپنی تلاش کے لئے کوہِ طور کی اونچائی سر کرنی پڑی۔ لیکن غالب کا مسئلہ کچھ اور تھا۔ انہیں جو کچھ بھی خوبصورت نظر آتا تھا وہ اس پر فدا ہو جاتے تھے۔

باغ میں پھولوں کا نظارہ غالب کو تڑپا دیتا تھا۔

سحر دمیدہ و گل در دمیدن، منخسپ

جہاں جہاں گل نظارہ چیدن است منخسپ

صبح ہو چکی ہے اور پھول کھل رہے ہیں۔ جاگ، یہ سماں تو جی بھر کر پھولوں کو دیکھنے کا ہے جن کی ایک دنیا آباد ہو چکی ہے۔ آنکھیں کھول اور دیکھ۔

پھر اس انداز سے بہار آئی

کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطہ خاک

اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر

روکشِ سطحِ چرخ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی

بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کو دیکھنے کے لئے

چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

اور پھر بہار کا موسم آ گیا۔ دنیا بدل گئی۔ ہر طرف خوبصورتی ہی خوبصورتی پھیل گئی۔ انسان تو کیا سورج اور چاند بھی دنگ رہ گئے۔ اے انسان دیکھ: حُسن کس طرح سجا ہوا ہے۔ نرگس سبزہ و گل کو دیکھ رہی ہے۔ حُسن حُسن سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

موسم بہار میں سانس لینا ایسا ہے جیسے شراب پی کر بیخود ہونا۔ بغیر پیئے ہم نشے میں ہیں۔ یہ سب حُسن کی کارفرمائی ہے۔

غالب کے ذہن میں حُسن کے راز پانے کی جستجو اُن کی اولین کھوج لگتی ہے۔

بخشے ہے جلوہ گل، ذوقِ تماشا، غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

پھول کا یعنی حُسن کا جلوہ انسان میں ذوق جستجو پیدا کرتا ہے کہ آخر حُسن کے پیچھے کیا ہے۔ ضروری ہے کہ انسان کی دیکھنے سننے اور سمجھنے کی صلاحیتیں حُسن کے نظارے کے لئے پوری طرح بروئے کار لائی جائیں۔ نظارہ کا جلوہ نظارہ کے شوق کے شعلہ کو اور بھی بھڑکا دیتا ہے۔

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق، حلقہء بیرونِ در ہے آج

موسم بہار کیا خوب رنگ لایا ہے۔ گلشن کی شکل ہی بدل گئی ہے۔ جدھر نظر پڑتی ہے حُسن کا پھیلاؤ ہے۔ حُسن کی کرامت ہے کہ قمری کے گلے میں سیاہ طوق جو اس کے قیدی ہونے کی علامت لگتا تھا، آج اس کے لئے آزادی کا دروازہ نظر آرہا ہے۔ حُسن کے جلوہ نے وہ مستی پھیلائی ہے کہ ہر شے آزاد ہو گئی ہے۔ قید و بند سے چھوٹ گئی ہے۔ ایک نئی دنیا سامنے ہے۔ یہ دنیا کیا

ہے۔ حسن کی دنیا، آزادی کی دنیا، مستی کی دنیا۔ یہی ہماری دنیا ہے۔ ہم اس پر فدا ہیں۔

اے موج گل نوید تماشائے کیستی
انگارہ مثال سراپائے کیستی

اے رنگین پھول تو کس کے نظارہ حُسن کی خوشخبری دے رہا ہے۔ تو کس کے آتشیں سراپا سے ابھرا ہوا ایک انگارہ ہے۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اور ہاں! یہ سبزہ زار کہاں سے آئے ہیں۔ یہ گل کس نے کھلائے ہیں۔ کیوں کھلائے ہیں۔ ان کا کیا مقصد ہے، اُن کا مقصود کیا ہے۔ زمین پر چلتی ہوئی ہوا کیا ہے۔ آسمان کی طرف دیکھو تو اَبر کیا ہے۔ یہ سارا حُسن کیوں بے حجاب ہوا ہے۔

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

آخر یہ پریوں جیسے چہرہ والے لوگ کیسے ہیں۔ ان کی پُر کشش اداؤں کا، دل لبھانے والے ناز و انداز کا کیا مقصد ہے، کیا پیغام ہے، یہ اگر حُسن ہے تو حُسن کیا ہے، حُسن کا پیغام کیا ہے۔ یہ ہمارے ہوش کیوں گم کر دیتا ہے۔ اگر ان کے جلوہ کے پیچھے کچھ ہے تو کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

ان کی سُرمہ بھری آنکھ سے نکلی ہوئی میرے دل میں اتر جانے والی نگاہ کے کیا معنی ہیں۔ ان کی پر مہک زلف میں مسحور کرنے والی شکن کس کے لیے ہے۔ حسینوں میں یہ سب کچھ کس طرح سے سمو گیا ہے۔ یہ کیا ہے اور کیوں ہے۔ ہم حیران و پریشان ہیں۔ عقل جواب دے گئی ہے۔ حسن ہم پر بیخودی کیوں طاری کر دیتا ہے۔

موسیقی کا حسن بھی غالب پر ایسا ہی اثر ڈالتا تھا جیسا موسمِ بہار اور پھول اور خوبصورت چہرہ کا حسن۔

ڈھونڈے ہے اس مغنّی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

رات کے وقت آسمان پر چمکتے دمکتے ستارے بھی غالب کے لئے حُسن کا جلوہ تھا۔ وہ حیران تھے کہ بنات النعش نامی ستاروں کی ٹکڑی دن کو چلی جاتی ہے اور رات کو آ جاتی ہے۔

تھیں بنات النعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

غالب معشوق کے قد و رخ اور حسین چہرہ پر ہی فدا نہیں تھے بلکہ

با موج خرامش سخن از بادہ مگوئید
کآب رخ ایں جوہر سیالہ فرو ریخت

معشوق کے موجِ خرام کے اثر کے سامنے شراب کی بات نہ کرو کیونکہ موجِ خرام کے روبرو شراب کی آبرو جاتی رہی ہے۔ شراب بے وقار ہو کر رہ گئی ہے۔ موجِ خرام کا نشہ شراب کے نشہ سے زیادہ ہے۔

بلائے جہاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا ہے
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

حُسن کے پیچھے کیا ہے کی تلاش نے غالب کو ایسے مقام پر پہنچا دیا کہ ان پر عیاں ہو گیا:

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

اے حُسن جہاں بھی تیری کارفرمائی ہے، ہمیں وہیں زندگی کا مقصود نظر آتا ہے۔ گل میں، گلشن میں، حسینوں کے چہرہ میں، موسم بہار کی رنگینیوں میں حُسن ہی کی شان نظر آتی ہے۔ ہمارے لئے تو یہی جنت ہے۔ جہاں حُسن ہے وہاں سب کچھ ہے۔ جہاں حُسن نہیں ہے وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔
لیکن غالب کو جلوہ حُسن کے راز پانا آسان بات نہیں لگتی۔ اس میں دشواریاں ہیں۔

ہنوز محرمیٔ حُسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُن مو کام چشمِ بینا کا

مجھے اب تک حُسن کا سراغ نہیں ملا۔ اس کی حقیقت مجھ پر نہیں کھلی حالانکہ میں ہر طرح سے اس کی تلاش میں ہوں۔ میرے جسم پر ایک ایک بال

چشم بینا بنا ہوا ہے۔

غالب کی راہ میں ایک دشواری اور بھی ہے۔ اُنہیں حُسن کا جلوہ نظر آتا ہے اور نظر نہیں بھی آتا۔

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا
جوش بہار، جلوے کو جس کے نقاب ہے

حُسن کا جلوہ ایسا ہے جیسے بجلی گر جائے۔ ایک لمحہ بقعہ نور اور پھر اندھیرا جیسے کوئی نقاب پڑ گئی ہو۔ پھر کتنا ہی دیکھو، جو پہلی جھلک میں نظر آیا تھا وہ نہیں دکھائی دیتا۔ یہ حُسن کے مظہر کا کرشمہ ہے، نظر آتا ہے، پھر نظر آنا بند ہو جاتا ہے حالانکہ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

ہمارا حُسن کے پیکر کے سامنے آنا کیا تھا، ایک بجلی سی کوند گئی۔ میں گنگ ہو گیا بات کرنا چاہتا تھا لیکن نہ کر سکا۔ زبان موجود رہی لیکن ایک لفظ نہ بول سکی۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

اب یہ کون بتائے کہ حُسن کا جلوہ کیا ہے۔ یہ جلوہ گری کس کی ہے۔ کس لئے ہے۔ ہماری سمجھ اور جلوہ کے بیچ ایک پردہ حسن حائل ہے۔ ہم نے بہت جستجو

کی بہت پاپڑ بیلے لیکن ہم پر یہ راز کھلنے ہی میں نہیں آتا۔

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ تیرے رخ پر بکھر گئی
مونہہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

حُسن کا نظارہ، نظارہ بھی ہے اور نقاب بھی، حسن کے پیچھے جو حقیقت ہے اسے ظاہر بھی کرتا ہے اور چھپاتا بھی ہے۔ ہمیں تو مست کر دیتا ہے۔ ہم بیخود ہو جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں تو ہماری نگاہیں منتشر ہو کر تیرے چہرہ پر بکھر جاتی ہیں۔ بکھری ہوئی نگاہیں نقاب بن جاتی ہیں۔ ہمیں نظر نہیں آتا کہ نقاب کے پیچھے کیا ہے۔ ہم یہ راز پا نہیں رہے۔ حُسن کا نظارہ ہمارے اور نظارے کے درمیان آجاتا ہے۔

چہ پری و چہ حیرانی کہ ہنگامِ تماشایت
نگاہ از بیخودی ھا دست و پا گم کرد و مژگاں شد

تو کیا پوچھتا ہے اور کیوں حیران ہو رہا ہے۔ تجھے دیکھتے ہی میری نگاہیں بے خود ہو جاتی ہیں اور اس بیخودی کے باعث (ہاتھ پاؤں کھو بیٹھتی ہیں)

ہاتھ پاؤں کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ میرے جسم کا ایک ایک بال آنکھ بن جاتا ہے۔

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرش، شش جہتِ انتظار ہے

ہمیں یہ علم نہیں ہوا کہ جو مظاہرہ ہماری حیرت کا باعث بنا ہے، جو جلوہ حُسن ہم نے دیکھا اور جو اُس میں ہم نہیں دیکھ سکے، اس کے پیچھے کیا کارفرما ہے۔ اس کا اشارہ کیا ہے۔ وہ کس کا سراغ دے رہا ہے۔ ہم تو اس سے بالکل ہی بے خبر ہیں۔ ماضی میں، مستقبل میں، دائیں جانب، بائیں جانب، آسمان کی جانب سے یا زمین کی طرف سے، ہم منتظر ہیں کہ ہماری عقل و دانش میں بھی کچھ آئے۔

اس مقام پر مرحلہ آ جاتا ہے کہ غالب حُسن کے اظہار اور بیک وقت اخفاء کا راز پانے لگے ہیں۔ اور حُسن کے راز پانے کی کھوج میں اُنہیں اپنے مقام کا بھی احساس ہونے لگا ہے۔

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

حُسن کے سو جلوے دکھانے والے معشوق کے دیدار نے شراب جیسا

نشہ چڑھا دیا۔ ہمیں بیخود کر دیا۔ ہم حیران و پریشان رہ گئے۔ تیرے جلوہ رنگین سے بیخودی ملی اور تیرا سراغ لگانے کی جستجو میں حیرانی کے سوا اور کچھ نہ ملا۔ ٹھیک ہے تیرے جلوہ رنگیں کا رتبہ تجھ سے ہے۔ لیکن ہمارا بھی رتبہ ہے۔ ہم نے خوب مشاہدہ کیا، اور اس کوشش میں ہم نے اتنا کچھ پہچان لیا کہ حیران رہ گئے۔ ہمارا بھی مقام ہے۔ ہم میں بھی تیرا راز پانے کی صلاحیت ہے۔ تبھی تو حیران رہ گئے۔ ہمیں کچھ سراغ تو ملا۔ ہم نے کچھ پہچاننا تو شروع کیا۔
بالآخر غالب نے معشوق کے جلوے کو منتہائے حسن قرار دے دیا۔

منظور تھی یہ شکل، تجلی کو نور کی
قسمت کھلی، ترے قد و رخ سے ظہور کی

لیجئے، منتہائے حُسن نے جلوہ دکھا دیا۔ کہاں دکھا دیا؟ میرے معشوق کے قد و رخ میں دکھا دیا۔ ظہور کے عمل کی قسمت کھل گئی۔ اسے ظہور کے لئے میرے معشوق کا پرتو مل گیا۔
ایک طرف تو کہتے ہیں۔

تا غالب مسکیں چہ تمتع بُرد از تو
برداشتۂ آنچہ خود از چہرہ، نقاب است

اے جلوہ گر تو ہی بتا مسکین غالب تیرے جلوہ سے کیا لطف لے سکتا ہے۔ تو نے اپنے چہرہ سے نقاب اٹھائی ہے لیکن میرے لئے تیرا چہرہ پھر بھی نقاب میں ہے۔

لیکن دوسری جانب دعوے کرنے لگے ہیں کہ وہ حُسن کے راز کا سراغ حجاب سے لگا لیں گے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

اے حُسن تو یہ نہ جان کہ محض تو ہی اپنے راز کا محرم ہے۔ ہمیں پتہ ہے کہ تو اپنے اوپر پردے ڈالتا ہے، پردوں کے پیچھے تو ہی ہے۔ پردے بھی تیرے ہی حُسن کا جلوہ ہیں۔ ہم تیرا سراغ پردہ سے لگا لیں گے۔

☆ ☆ ☆

رفتہ رفتہ غالب اپنی سوچ کے ایک نئے مرحلہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ ایک طرف تو اُن میں احساس اجاگر ہو رہا ہے کہ حُسن اپنا جلوہ دکھانے کا مشتاق ہوتا ہے۔ حُسن کی صفت میں حُسن کا اظہار شامل ہے۔ دوسری جانب غالب میں یہ احساس پیدا ہونے لگا ہے کہ وہ بھی حُسن ہیں۔ وہ اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔

نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل

مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

دیکھ جب بہار آتی ہے تو پھول کھل جاتا ہے۔ پنکھڑیاں پھیل جاتی ہیں۔ پھول اپنا جوبن دکھاتا ہے۔ اپنے آپ کو دنیا کے سامنے کھول دیتا ہے، دراصل حُسن اپنے آپ کو ظاہر کر دیتا ہے۔ مستی میں حُسن کے لئے اپنے آپ کو ظاہر کرنا لازمی ہے۔

ہم بھی مست ہیں۔ ہم نے اپنے دل و ماغ کے بند کھولے ہوئے ہیں۔ مستی کے عالم میں ہمارے پاس چھپانے کو کچھ نہیں ہے۔ کوئی آئے اور ہمیں فتح کرے۔ ہم تیار ہیں۔ ہم بھی تو حُسن ہیں۔

مشتاق عرضِ جلوۂ خویش است حُسنِ دوست

از قرب، مژدہ دہ نگہ نارسائے را

ہمیں یہ بھی علم ہے کہ حُسنِ دوست اپنا جلوہ دکھانے کا مشتاق ہے۔ کائنات اپنے راز افشا کرنے کے لئے بے چین ہے۔ ادھر ہم اس کے راز معلوم کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ یہ ہماری نگاہوں کے لئے اچھی خبر ہے کہ دوست قریب ہے جس کا نظارہ ہر طرف کیا جا سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت تک ہم پانے اور سمجھنے کے اس مقام تک نہیں پہنچ سکے جس کے ہم طالب ہیں۔

غالب حُسن کی تجلی کے لیے بیتاب ہیں۔ دل ہی دل میں سوچتے ہیں کہ شاید ابھی ظہور کی تیاری مکمل نہیں ہوئی۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ایسا لگتا ہے تیرا جلوہ ابھی اپنے ظہور کی تیاری میں مصروف ہے۔ تو اپنی آرائش سے ابھی فارغ نہیں ہوا۔ اپنے آپ کو نقاب کے اندر ہی دیکھنے اور سنوارنے میں مصروف ہے۔ اس طرح سنوارنے میں کہ ہم اس کے راز پا لیں۔

براہِ راست اپیل بھی کرتے ہیں۔

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

بس! اب جلوہ دکھادے، بہت بناؤ، سنگار ہو چکا۔ منہ موڑ کر تو دیکھو۔ تجھے اپنے میں کیا نظر آئیگا۔ ہم ہیں عاشق، ہم ہیں تیری دلکشی پر مرنے والے۔ ہماری طرف رجوع ہو۔ ہم کس تمنا سے تیرے منتظر ہیں۔

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب! ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

اے اس جہاں کو حُسن سے منور کرنے والے خورشید صفت! ہماری طرف بھی نظر کر۔ ہم سایہ کی طرح ہیں۔ جیسے سایہ کو سورج نظر نہیں آتا، سورج کی گردش سے وہ بھی گردش میں رہتا ہے اسی طرح ہم بھی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ حُسن کے سائے میں ادھر اُدھر مارے مارے پھر رہے ہیں کہ حُسن کا راز پالیں۔ سایہ سورج کو کیسے دیکھے؟

☆ ☆ ☆

غالب جانتے ہیں کہ عشق کرنا بڑے صبر، تحمل اور حوصلہ کا کام ہے۔ ذہن پر تمنا پوری کرنے کا دباؤ بہت زیادہ ہے۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

لیکن بعض اوقات پریشانی بہت بڑھ جاتی ہے۔ جلوہ دیکھنے کے لئے بے چین ہیں۔ اپنی طرف سے تیاری مکمل کر لی ہے۔ انہیں یقین ہے جلوہ دکھانے والا بھی جلوہ دکھانے کے لئے بے چین ہے۔ لیکن ابھی کچھ کسر ہے، شاید تیاری مکمل نہیں ہوئی۔ طرح طرح کے جتن کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ زکوۃ لینے کو بھی تیار ہیں۔ فرماتے ہیں:

زکاتِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو، کاسہ گدائی کا

اے میری عقل و دانش کو روشن کرنے والے: اپنے حسن کی زکوۃ دے
اور مجھ پر عیاں ہو جا، تاکہ میرا بھیک مانگنے کا پیالہ میرے گھر کا چراغ بن جائے۔
پھر سوچتے ہیں کہ شاید کوئی تحفہ پیش کرنے سے ہی کام بن جائے۔ فرماتے ہیں:

پئے نظر کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعوی پارسائی کا

میرے پاس تجھے پیش کرنے کے لیے شرمِ نارسائی کے علاوہ کوئی اور
تحفہ نہیں ہے۔ میں نے تجھے پانے کی بہت کوشش کی۔ میں نے پارسائی کے غلط
دعوے بھی کئے۔ یہ دعوے طرح طرح سے خونم خون ہو گئے۔ تجھ تک نہ پہنچ سکنے
کی وجہ سے بہت شرمندہ ہوں، اور یہ شرم کا تحفہ تیری نذر کر رہا ہوں۔
ساتھ کے ساتھ غالب کو اپنی تلاش پر بھی شک ہونے لگتا ہے۔

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

ہم تو دوہری مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ ہمیں تو اپنے پر شبہ ہونے لگا
ہے۔ آخر ہم کیا ہیں؟ ہم جو حیرت زدہ ہیں کیا یہ کمی ہماری تو نہیں ہے۔
دوسری جانب ہم کسی وہم میں تو نہیں پڑ گئے۔ شاید جو دیکھنا سمجھنا چاہتے ہیں اس
میں حقیقت ہی نہ ہو۔ وہ شاید ہمارا وہم ہی ہو۔

لیکن ہم پھر بھی ہمت سے کام لیتے ہیں۔ دل نہیں چھوڑتے۔

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز

غالب، تو جگہ بہ جگہ تلاش میں ہے، بیاباں نوردی کر رہا ہے، ڈھونڈ رہا ہے کہ حُسن کیا ہے، کس کا حُسن ہے، حُسن کے پیچھے کچھ ہے بھی یا نہیں، تُو اس وہم میں نہ پڑ۔ انتظار کر۔ ابھی تیری جستجو میں نشیب و فراز آئیں گے۔

غالب اپنا دعویٰ دائر کرتے ہیں۔

بیں کہ در گل و مل جلوہ گر برائے تو کیست
مپوش چشم ز حق طالب رضائے تو کیست

دیکھ تو سہی کہ حسن کا ظہور کس کے لئے ہے۔ حسن کا جلوہ دیکھنے کی اہلیت کس میں ہے۔ اے جلوہ گر ادھر بھی دیکھ کہ میں ہوں جو تیری رضا کا طالب ہوں تیرا سچا اور وفادار عاشق ہوں جو تیرے جلوہ کی تیری رضا کے مطابق اور جلوہ کی اصلیت کے مطابق اس کی ترجمانی کرے گا۔

فرماتے ہیں

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

کوہ طور پر برقِ تجلی گری اور پہاڑ بھسم ہو گیا۔ یہ طور پر جلوہ دیکھنے والے کے ظرف کے مطابق ہوا۔ وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ تیرے جلوے کو سہ سکے۔ اس پر برق تجلی گرانی ہی نہیں چاہیے تھی۔ جس طرح شراب انڈیلتے وقت پینے والے کی اہلیت کا پتہ ہونا چاہیے اسی طرح تجلی کے ظہور کے وقت طالب کی اہلیت کا پتہ ہونا چاہیے۔ برقِ تجلی ہم پر گرنی چاہیے تھی۔

ہم تو حُسن کے جلوہ کے پیچھے کی کارفرمائی سمجھنے بوجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ہماری راز پانے کی صلاحیت پختہ ہے۔ ہم پر جب راز افشا ہو گا تو طور کی طرح بھسم نہیں ہونگے۔

چوں نیست تاب برقِ تجلی کلیم را
کے در سخن بہ غالبِ آتش بیاں رسد

کلیم (موسےٰ) میں برقِ تجلی کو برداشت کرنے کی تاب نہیں تھی۔ وہ گفتار میں غالبِ آتش بیاں تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔

چرا بہ سنگ و گیاہ پیچی اے زبانہ طور
ز راہ دیدہ بدل در رو و زجاں برخیز

اے شعلۂ طور تو پتھروں اور گھاس پھوس سے کیا الجھتا ہے۔ ہماری آنکھوں کی راہ سے دل میں اتر جا اور روح میں سما کر ابھر آ۔

د ہر جُز جلوہ ٔ یکتائی معشوق نہیں

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجئے خیال
دیدہ و دل کو زیارت گاہ حیرانی کرے

سوچا جائے، خیال کیا جائے تو معشوق کے حُسن کے پرتو نے میرے دل کا وہ حال کیا ہے کہ میں اتنا حیران ہوا، اتنا حیران ہوا کہ اپنے سے بھی کھو گیا۔ کسی دل پر اتنا اثر تو کبھی نہ دیکھا تھا، نہ سنا تھا۔ واہ واہ کیا پُر اثر حُسن کا جلوہ تھا، جس نے دل کا یہ حال کر دیا۔ حیرانی کچھ اور ہی بن گئی۔

جنوں محمل بہ صحرائے تحیر راندہ است امشب
نگہ در چشم و آہم در جگر واماندہ است امشب

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم فرماتے ہیں: عشق و محبت کے انتہائی مقامات میں ایک مقام حیرت ہے۔ مقامِ حیرت وہ مقام ہے کہ جہاں انسان، محبوب کے تصور میں ایک ہی جگہ ٹھہر جائے یا رُک جائے۔ اسی مقامِ حیرت کو مرزا غالب نے تحیّر کہا ہے اور اس کیفیت کو بڑے خوبصورت اور پرزور اسلوب میں یوں بیان کیا ہے:

ہمارا جنون شوق آج صحرائے تحیر میں محمل رانی کر رہا ہے یعنی عیش سے گھوم رہا ہے، نگاہ آنکھ ہی میں اور آہ سینے میں ختم کر رہ گئی ہے۔ ہم سکتہ میں چلے گئے ہیں۔

بالآخر ایسا لگتا ہے کہ غالب کی سن گئی۔

دوشم آہنگ عشا بود کہ آمد درگوش
نالہ از تارِ ردائی کہ مرا بود بدوش

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم لکھتے ہیں: فارسی کی یہ غزل مسلسل ہے۔ اس کی ہیئت بظاہر غزل کی سی ہے، لیکن یہ ایک نظم ہے۔

گذشتہ رات ایک واقعہ گزرا۔ ایسا لگا جیسے میں نے عشاء کی نماز ادا کرنے کا قصد کیا ہوا ہے۔ میرے کندھے پر ایک چادر ہے اور چادر کا ایک تار میرے کان میں نالہ کر رہا ہے۔ اس کی فریاد تھی

کائے خسِ شعلۂ آواز موذن، زنہار
از پی گرمی ہنگامہ منہ دل بخروش

اے موذن کی آواز کے شعلہ سے جل جانے والے تنکے! ہوش کر، اژدہام کے ساتھ چلنے کے شوق میں ایسے شور (شور اذان) پر دل کو مائل نہ کرنا۔ جو ہر کوئی کرتا ہے اور سمجھتا ہے، ضروری نہیں کہ وہ درست ہو۔

تکیہ بر عالم و عابد نتواں کرد کہ ہست
آں یکے بیہدہ گو، این دگرے بیہدہ کوش

عالم اور عابد پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عالم بیہدہ گوئی کرتا ہے اور عابد بیہدہ عمل میں محو ہے۔ یعنی عالم کا فضول وعظ اور عابد کی عبادت دونوں بیکار ہیں۔

غالب نے ایک اور جگہ بھی کہا ہے۔

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن از کفر و ایماں می رود

باتوں کے سوا کفر اور ایمان کہاں ہیں۔ اور باتیں بھی کفر اور ایمان کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے کی جاتی ہیں۔

نیست جز حرف درآں فرقہ اندر ز سرائے
نیست جز رنگ دریں طائفہ ارزق پوش

اس وعظ گو فرقے (یعنی فرقہ علما) میں سوائے لفاظیوں کے اور (طرح طرح کے لبادے) پہننے والے (یعنی عابد) گروہ میں سوائے زیبائش رنگ کے اور کچھ نہیں۔

جادہ گذار و پریشاں رو و در راہ روی
بفریب مے و معشوق مشو رہزنِ ہوش

اپنی پرانی ڈگر کو چھوڑ اور آزادانہ چل اور کہیں یہ نہ ہو کہ چلنے میں شراب اور معشوق کی فریب کاریوں میں اپنے ہوش کھو دے۔ آزادانہ چلنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تو شراب پینے اور عشق کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنالے اور عقل و ہوش کا راستہ ترک کردے۔

بوسہ گر خود بود آساں، مبر از شاہد مست
بادہ گر خود بود ارزاں، مخر ازبادہ فروش

بوسہ کا ملنا آسان ہی کیوں نہ ہو پھر بھی معشوق سے قبول نہ کر اور شراب ارزاں بھی کیوں نہ ہو جائے بادہ فروش سے مت لے۔ معشوق کے بوسہ کے لئے تو جان بھی دی جاسکتی ہے۔

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

آپس کا فیصلہ یہ تھا کہ تو مجھے بوسہ دے، میں جان دینے کو تیار ہوں۔ لیکن اس لمحہ معشوق جانتا ہے کہ غالب ابھی نیم جاں نہیں ہے۔ اس میں جان باقی

ہے۔ اگر اب بوسہ دے دیا تو شاید اس کی جان نہ نکلے اور وہ وعدہ پورا نہ کر سکے۔ لہٰذا ابھی بوسہ نہ دیا جائے۔

غالب فرماتے ہیں کہ آسانی سے ملنے والا بوسہ اور سستی ملتی ہوئی شراب نہ لے۔ کتنی ہی دل خوش کن نہ ہو، احسان نہ اٹھا۔

ایں نشید است کہ طاعت مکن و زہد مورز
ایں نہیب است کہ رسوا مشو و بادہ منوش

میرے نغمہ کا پیغام ہے کہ آزاد ہو جا۔ اپنے فیصلے خود کر۔ بندگی چھوڑ دے۔ زہد و تقویٰ کی رسومات سے چھٹکارا حاصل کر۔ رسوائی سے بچنے کے وعظ اور شراب نہ پینے کی نصیحتیں محض ڈرانے والی باتیں ہیں۔ ان کا خیال نہ کر۔

یہی مضمون اردو اور فارسی کے ان دو اشعار میں ہے۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

حاصل ایں است دریں جملہ نبودن کہ مباش
مانے افسانہ سرائیم و تو افسانہ نیوش

ہم تجھ سے افسانہ گوئی نہیں کر رہے ہیں۔ تو ان افسانوں کو نہ سن جو

نصیحتوں کے طور پر گھڑے جاتے ہیں کہ یہ نہ ہونا وہ نہ ہونا (نبودن)، یہ کرنا غلط ہے وہ کرنا غلط ہے۔ ایسے افسانوں کا خلاصہ تو یہ ہے کہ کچھ بھی نہ ہو، کچھ بھی نہ کرو۔ یہ تیری راہ نہیں ہے۔

منکہ بودے کُلّم از مزد عبادت خالی
چوں دلم گشت تونگر بہ رہ آورد سروش

غیب سے آواز سن کر غالب حیران ہو جاتے ہیں۔ مجھے یہ پیغام کہاں سے مل رہا تھا، یہ کس کا پیغام تھا۔ میں تو عبادت کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ نہ ہی میرے پاس زہد وتقویٰ کا سرمایہ تھا۔ پھر میرا دل اس فرشتۂ غیبی کی خوشخبری کی دولت سے کیسے مالا مال ہوا۔

گفتم از رنگ بہ بیرنگی اگر آرم رو
رہ دگر چوں سپرم، گفت زخود دیدہ بپوش

میں نے پیغام کے جواب میں کہا کہ اگر میں رنگ سے بیرنگی کا رخ کرنا چاہوں تو راستہ کیسے چلوں، جواب ملا اپنے آپ سے آنکھیں بند کر لے۔
دنیا میں نیکی بدی، غلط صحیح، حق ناحق، گناہ ثواب کی اقدار نے اپنا رنگ جمایا ہوا ہے۔ میں نے فرشتۂ غیبی سے کہا کہ میں اس جمے ہوئے رنگ کے نظام کو بیرنگی کے نظام کی طرف لے جاؤں تو کونسا راستہ اختیار کروں۔ جواب

ملا۔ بھول جا کہ تو بھی کچھ ہے۔ تو راستہ بدلے گا تو تو کچھ ہو جائیگا۔ پرواہ نہ کر۔ اپنا راستہ اختیار کر۔

ایک اردو غزل کا شعر بھی اسی مضمون سے متعلق ہے۔

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اگر اپنی حقیقت معلوم کرنی ہے تو اپنی خودی کو ختم کر دے۔ جیسے گھاس پھونس یہی خدمت سرانجام دیتے ہیں کہ خود جل کر دوسروں کے لئے حرارت پیدا کریں۔ غالب تیرے ذہن میں اپنی اہمیت ختم ہو جائیگی تو تجھے تیرے وجود کا پتہ چل جائے گا۔ تو اپنی مشعل خود بن جائے گا۔

جستم از جائے ولے ہوش و خرد پیشا پیش
رفتم از خویش ولے علم و عمل دوشا دوش

میں جست لگا کر چل پڑا۔ ہوش و خرد مجھے خیر باد کہہ گئے۔ میں نے ایک نئی ہیئت اختیار کر لی۔ میں کہیں جا رہا تھا۔ اردگرد کا مجھے پورا علم تھا۔ میں چلتا گیا۔

تا بیزی کہ بیک وقت در آنجا دیدم
بادہ پیمودنِ امروز و بخوں خفتنِ دوش

یہاں تک کہ ایک ایسی بزم میں پہنچا کہ میں نے دیکھا کہ وہاں بیک وقت گذشتہ کل کی آلائشیں اور آج کی فرمائشیں (ماضی کی قدامتی روایات اور آج کے ترقی کے تقاضے) دونوں موجود تھیں۔ ماضی اور حال ایک دوسرے میں سموئے ہوئے تھے۔

خانقاہ از روش زہد و ورع، قلزم نور
بزم گاہ از بوسہ و مے، چشمۂ نوش

خانقاہ کے مکینوں کی عبادت اور پارسائی کے ساتھ ساتھ اور رندوں کے بوس و کنار اور مے نوشی کے باعث پوری محفل شہر نور بنی ہوئی تھی۔
یعنی دو ضدیں بیک وقت موجود تھیں۔ رند رندی میں اور پارسا پارسائی میں مشغول ہو کر ایک ہی حقیقت کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ ایک ہی سکے کے دو رُخ تھے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

حُسن کا جلوہ لطافت اور کثافت کے تضاد کا مرہون منت ہے۔ موسم بہار آتا ہے۔ پھول کھلتے ہیں۔ پرندے چہچہاتے ہیں۔ ہر طرف حُسن ہی حُسن ہوتا ہے۔ چمن کی حیثیت ایک آئینہ کی پشت پر ملمع کی ہے۔ چمن حُسن کا جلوہ ایسے دکھاتا ہے جیسے معشوق آئینہ میں اپنے چہرہ کے حُسن کا جلوہ دیکھتا ہو۔ اور

آئینہ کیا شے ہے۔ یہ تو شیشہ پر زنگار کا ملمع ہوتا ہے۔ لیکن زنگار جس کی الگ اپنی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے اور معشوق کا چہرہ مل کر جلوہ پیدا کر دیتے ہیں۔ جیسے جب بہار کا موسم آتا ہے تو چمن کے آئینہ میں حُسن چمکنے دمکنے لگتا ہے۔ یہ چمن کو زیب نہیں دیتا کہ وہ خود حسین ہونے کا دعویٰ کرے، کیونکہ اس کے حُسن میں بہار کا ہاتھ بھی ہے۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

اصل دنیا وہی ہے جہاں عشق ہے، وہ عشق جو رنج وغم برپا کرتا ہے، عاشقوں کو برباد کر دیتا ہے۔ جس کی آرزوں پر تباہی کی بجلی گرتی رہتی ہے۔ جس کی انجمن میں عشق کے نور کی شمع اور آفات کی بجلیاں ساتھ ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ یہی رونق ہستی ہے۔

شاہد بزم درآں بزم کہ خلوت گہ اوست
فتنہ بر خویش و بر آفاق کشودہ آغوش

معشوق بزم کے مطابق یہ کوئی مجلس عام نہ تھی، یہ اس کی خلوت گاہ تھی جس نے اپنی آغوش میں اپنا حُسن اور پورے آفاق کا فتنہ لیا ہوا تھا۔ جو حُسن اور غیر حُسن کی یکجائی سے سجی ہوئی تھی۔

ہمچو خورشید کزو ذرہ درخشاں گردد
خوردہ ساقی مے و گردیدہ جہانے مدہوش

جس طرح سورج بلا امتیاز ہر ذرہ کو چمکا دیتا ہے۔ اسی طرح جان محفل خود بھی بیخود تھے اور پورے جہاں کو بھی بدمست کئے ہوئے تھے۔ ان کے جلوہ حُسن سے نیکی و بدی، ایمان اور کفر برابر کے سرشار تھے۔ گوناگوں گہرائیوں میں سب کچھ عیاں تھا۔ سمجھ، عقل اور علم کے سب راز افشا ہو گئے تھے۔

رنگہا جستہ ز بیرنگی و دیدن نہ بچشم
راز ہا گفتہ خموشی و شنیدن نہ بگوش

اس مقام پر بیرنگی سے ایک عالم رنگ ابھر رہا تھا اور یہ عالم بیرنگی آنکھوں سے دیکھنے کا نہیں تھا۔ خموشی راز سے کہہ رہی تھی اور یہ راز کانوں سے سننے کی چیز نہ تھی۔ ساری بات سمجھنے کی تھی۔ نہ دیکھنے کی تھی، نہ سننے نہ کہنے کی۔ تضادات کے اختلاط سے ایک نقشہ ابھر رہا تھا۔ ایک راز افشا ہو رہا تھا۔ پورے عالم کے تضادات ایک رنگ، ایک حقیقت کی شکل میں رونما ہو رہے تھے۔

قطرہ ناریختہ از طرف خم و رنگ ہزار
یک خم رنگ و سرش بستہ و پیوستہ بجوش

خم سے ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکا تھا اور ہزار رنگ رونما تھے۔ ایک خم رنگ تھا اور اس کا منہ بند تھا، اور وہ ہمیشہ کی طرح جوش سے لبریز تھا۔

مجھ پر تو سب کچھ عیاں ہو گیا۔ میرے سامنے بکھرے ہوئے ہزار رنگ یک رنگی میں نمودار ہو گئے۔ لیکن معشوقِ محفل، سراپا حُسن، کا منہ بند تھا۔ اس کی طرف سے نہ کوئی لفظ تھا نہ کوئی اشارہ لیکن وہ جوش سے اُبل رہا تھا۔ حقیقت ایزدی بے چین تھی کہ اپنے راز کھول دے۔

همه محسوس بود ایزد و عالم معقول
غالب ایں زمزمه آواز نخواهد خاموش

مجھ پر عیاں ہوا کہ ایزد بھی محسوسات میں سے ہے اور عالم بھی احاطۂ عقل میں ہے۔ لیکن اے غالب! یہ زمزمۂ راز، آواز میں نہیں سما سکتا اس لئے خاموش ہو جا۔

مژده صبح دریں تیره شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

ان سیاہ راتوں میں مجھے مژدہ' صبح دیا گیا۔ شمع بجھا دی گئی اور خورشید کی نشاندہی کر دی گئی۔

اس غزل میں بیان کی ہوئی کیفیات سے گزرنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ غالب نے کسی منزل کو پا لیا۔ گو انہیں یہ احساس ضرور رہا کہ اُن کو جو حاصل ہوا ہے اُس کے بعد بھی حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ باقی رہ گیا ہے۔ جتنا ہمارے علم میں اضافہ ہوا ہے، اسی کے حساب سے ہمیں پتہ چلا ہے کہ کیا کچھ ہے جس کا ہمیں علم نہیں ہے۔

راز دیدن با مجوے و از شنیدن با مگوے
نقشہا در خامہ و آہنگ ھا در تار ہست

آنکھ اور کان کھلے رکھنے سے کیا کیا راز کھلے ہیں یہ نہ پوچھ بے شمار نقش ہیں، جو ابھی زیرِ قلم نہیں آئے اور ہزار ہا سُر ہیں جو ساز کے تاروں میں سوئے ہوئے ہیں۔

غالب کو پہلی بنیادی نشاندہی تو یہ ہوئی کہ

تا شاہد رازت بخموشی شدہ رسوا
چوں پردہ بہ رخسار فرو ھست بیاں را

ایزد کا راز پا کر اور عالم کو احاطۂ عقل میں لے کر ہم نے خاموشی

اختیار کر لی۔ ہم نے راز کے علم کو نقاب بنا کر چہرہ پر ڈال لیا۔ اس طرح ظاہر بھی کر دیا اور چھپا بھی لیا۔ ہم نے کچھ نہیں کہا، لیکن بتا دیا کہ کیا نہیں کہا۔ رسوائی کی بات کہاں ہے۔

غالب نے اپنے اشعار میں خاص طور پر یہ خیال رکھا ہے کہ بنیادی افکار بلند آواز سے واضح نہ کئے جائیں۔

نشو ونما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

شاخوں کی نشو ونما جڑ سے ہوتی ہے۔ جو بنیادی بات ہے، جو اصل ہے وہ صرف خاموشی سے ہی ادا کی جا سکتی ہے۔ اسے نعرہ نہ بنایا جائے۔

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

میرے عشق کی سچائی اور خلوص نے بالآخر حُسن کے سب راز کھول دیئے ہیں۔ سب کچھ عیاں ہو گیا ہے۔ اب اگر کچھ حائل ہے تو میری نگاہ کی کم مائیگی۔ ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ اگر نگاہ ساتھ دے تو گہرے سے گہرے راز پالیں۔ حُسن کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ کم مائیگی ہے تو ہماری اپنی ہے۔

کردہ ام ایمان خود را دست مزد خویشتن
می تراشم پیکر از سنگ و عبادت می کنم

میں نے ایمان کو اپنی محنت کی مزدوری (اجرت) بنا لیا ہے، خود ہی پتھر تراشتا ہوں اور پھر خود اس کی عبادت کرتا ہوں۔ جیسے کوئی سنگ تراش بت تراشتا رہے تراشتا رہے اور پھر اپنی محنت کے نتیجہ کو اعلےٰ مقام دے۔ اسی طرح میں ہوں۔ اپنی تلاش میں بیاباں نوردی کر رہا ہوں اور اس محنت کے عوض جو بھی حاصل ہو وہی میرا ایمان ہے۔ یعنی ہر لحظہ ایمان کی تلاش میں ہوں۔ اصل کی تلاش میں کامیابیاں میرا ایمان بنتی جاتی ہیں۔

ایماں بغیب تفرقہ ہا رُفت از ضمیر
ز اسما گذشتہ ایم و مسمّی نوشتہ ایم

ہمارا غیب (جو نظر نہیں آتا) پر ایمان ہے۔ اس ایمان نے ہمارے ضمیر سے سب نفرتوں کو مٹا دیا ہے۔ ہر تفرقہ کسی نام سے ہوتا ہے اور ناموں کو چھوڑ کر ہم نے اپنے آپ کو اس سے وابستہ کر لیا ہے کہ جس کے یہ نام ہیں۔ دنیا کی تمام اشیاء کا فرق و امتیاز ہماری نظروں سے اٹھ گیا ہے۔

کفر و دیں چیست جز آلائشِ پندارِ وجود
پاک شو پاک کہ ہم کفرِ تو دینِ تو شود

تیرے غلط تصورِ خودی کے سوا کفر و دین کیا ہے۔ اس آلائش سے پاک ہو جا تاکہ تیرا کفر بھی تیرا ایمان (دین) بن جائے۔ فرماتے ہیں:

سر از حجاب تعین اگر بروں آید
چہ جلوہ ہا کہ بہ ہر کیش می تواں کردن

اگر انسان ان پردوں کو ہٹا دے جو اس نے اپنے پر (اپنی سمجھ پر) ڈالے ہوئے ہیں تو کیسے کیسے جلوہ ہائے حق ہیں جو ہر مذہب میں اسے نظر آئیں گے۔

غالب نے جب یہ موقف اختیار کیا تو مختلف مذاہب کے کٹر لوگ ان کے دشمن ہو گئے۔

شادم کہ بر انکارِ من شیخ و برہمن گشتہ جمع
کز اختلاف کفر و دیں خود خاطر من گشتہ جمع

میں نے کفر اور دین کے باہمی اختلاف سے انکار کیا ہے۔ میں خوش ہوں کہ میرے انکار نے شیخ و برہمن کو ایک ہی محاذ پر جمع کر دیا ہے، جس نے میرے دل کو تسکین دی ہے۔ شیخ دین کا حامی ہے اور برہمن کفر کا۔ میں نے کفر و دین کے وجود سے انکار کیا ہے۔ اس پر شیخ و برہمن دونوں دین کی حمایت میں جمع ہو گئے ہیں۔ اور مجھے یہ خوشی ہے کہ یہ باہم مل تو بیٹھے اور مجھے اس کشمکش سے

نجات مل گئی۔

دولت بغلط نبود، از سعی پشیماں شو
کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

خوش بختی یوں ہی نصیب نہیں ہوتی۔ اس کی کوشش کر اور پریشان ہو۔ دنیا میں صحیح راہ پر چلنے والے کے لئے بہت مشکلات پیش آتی ہیں۔ جھوٹ بولنے والے، فریب اور خوشامد کرنے والے بدنصیبوں کو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کی راہ چھوڑنا کافر ہونے کے برابر ہے۔ اگر تو کافر نہیں ہو سکتا تو ناچار مسلمان ہی ہو جا۔ کافر ہونا کٹھن کام ہے، ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ مسلمانی کی راہ پر چلنا آسان ہے۔

☆ ☆ ☆

غالب نے جو پایا، ان پر جو حقیقت عیاں ہوئی وہ حسن پرستی کی راہ سے ہوئی۔ فرماتے ہیں:

دہر، جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کائنات معشوق کے حُسن کے جلوے کی یکتائی کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ کائنات جو کچھ ہے ایک جلوہ ہے جو حُسن کی شکل میں

عیاں ہے۔ حُسن خود اپنے آپ کو دیکھنے کا مشتاق ہے۔ ہماری ذات بھی اسی کے حُسن کا حصہ ہے۔ اگر حُسن اپنے آپ کو نہ دیکھنا چاہتا تو ہم میں حُسن پرستی کی صلاحیت پیدا نہ ہوتی۔ نہ ہم ہوتے نہ حُسن اپنے آپ کو دیکھ سکتا۔

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر است
خویش را در پردۂ خلقے تماشہ کردۂ

تُو جلوے اور نظارے کو ایک ہی سلسلہ سمجھتا ہے۔ اس لئے، تو خلق کے پردے میں آکر خود ہی اپنا نظارہ کرا رہا ہے۔ جلوہ تیرا ہے، نظارہ میں کر رہا ہوں لیکن ہم دونوں ہیں تو ایک ہی۔

سرِ منزل رسائی اندیشۂ خودیم
در ما گم است جلوہ پئے رہنمائے را

ہمارے فکر کی رسائی کی منزل کیا ہے، وہ منزل ہم خود ہی ہیں۔ ہمارے رہنما کی صورت میں وہ منزل ہم ہی میں گم ہے۔ دنیا میں کسی کو معلوم نہیں کہ ہماری منزل کیا ہے۔ یہ ہم خوب جانتے ہیں۔ ہم خود ہی اپنے رہنما ہیں۔

موجہ از دریا، شعاع از مہر، حیرانی چراست
محو اصل مدعا باش و بہ اجزائش مپیچ

لہریں سمندر سے ہیں اور شعاعیں سورج سے، پھر حیرانی کیسی۔ تو بھی کسی شے سے ہے۔ اس کی طرف مائل ہو۔ اس کے اجزا کو چھوڑ دے۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس کے باب میں

میری نظر میں کائنات میں یکجہتی ہے۔ یکتائی ہے۔ جو شے دیکھی جائے اس کی اور جو اس کی شہادت ہو سب کی اصل ایک ہی ہے۔ جب ہم خود ہی مشاہدہ بھی ہیں اور مشاہدہ کرنے والے بھی تو ہم تو اپنی اصل دریافت کرنے کی کوشش میں ہیں۔ اسے مشاہدہ کا نام کیوں دیں۔ یہ تو ہم اپنے کو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پنہاں بہ عالم ایم، ز بس عین عالمیم
چوں قطرہ در روانیٔ دریا گمیم ما

سمندر میں قطرہ بجائے خود سمندر ہوتا ہے۔ قطرہ میں سمندر کے سب راز پنہاں ہوتے ہیں۔ جیسے ہمارے اندر کائنات کے راز پنہاں ہیں۔ دراصل ہم خود کائنات کے رازوں کے حامل ہیں۔

بر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے
یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

چھ اطراف، اوپر نیچے، آگے پیچھے، دائیں بائیں بلکہ پوری کائنات میں جو کچھ بھی ہے میرے لئے ایک ہی نقشہ ہے۔ ہم اس میں ناقص اور کامل کا امتیاز نہیں کر سکتے۔ ہم کسی کو اعلیٰ کسی کو ادنیٰ قرار نہیں دے سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی، رندی اور عبادت گزاری ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ اصل سکہ ہے جس میں سب راز پنہاں ہیں۔ میں کائنات کے علم کا طالب تھا اور ہوں۔ میں حُسن کی کھوج لگانے میں سرگرداں رہا ہوں۔ میں حُسن پرست ہوں، اور مجھ پر کائنات کے بہت سے راز افشا ہو چکے ہیں۔

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن
ز خود رفتیم و ہم با خویشتن بردیم دنیا را

جب دیکھنے والے کی نظر میں گہرائی نہ ہو، اور جب علم کا حصول اور دنیا کے راز پانے کی جستجو ختم ہو جائے یعنی انسان جب آنکھ بند کر لے تو دنیا کی ہستی اور وجود عالم پر لکیر کھنچ جاتی ہے۔ آدمی اپنے آپ سے بھی جاتا ہے اور اپنے ساتھ دنیا کو بھی لے جاتا ہے۔

اپنے آپ کو دریافت کرنے سے غالب پر عیاں ہوا کہ انسان چاہے تو کھوج کی سعی کرنے کے بعد راز افشا ہو سکتے ہیں۔

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

ہم سمجھتے ہیں کہ جس طرح دریا کے ایک قطرہ کی کھوج و مطالعہ سے پورے دریا کی اصل دریافت کی جاسکتی ہے اسی طرح کائنات کی اصل اس کے ایک جزو سے پہچانی جاسکتی ہے۔ ایسا کرنا انسان کے دائرہ امکان میں ہے۔ یہی دیدہ ، بینا کی تعریف ہے۔ برعکس ان لوگوں کے جو کائنات کے علم کو خود حاصل نہیں کرتے اور طرح طرح کے بے بنیاد نظریۓ تسلیم کرتے ہیں وہ کھیل تماشہ کرنے والے لڑکوں کی طرح ہیں۔

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

دریا کو دیکھئے، پانی کا کتنا وسیع پھیلاؤ ہوتا ہے۔ لیکن روانی کیلئے اسے پیٹ کے بل اپنے آپ کو ریت پر گھسیٹنا پڑتا ہے اور آگے بڑھنے کے لئے قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ آگے بڑھنے کے لئے نیچے گرنا پڑتا ہے۔ یوں وہ پہاڑوں اور میدانوں کی اونچائیوں سے اتر کر سمندر کی سطح تک پہنچ جاتا ہے۔ خودی کو ختم کر دیتا ہے۔

صحرا کو دیکھئے کتنا وسیع و عریض ہوتا ہے۔ آندھی آتی ہے تو پتہ نہیں چلتا کہ صحرا کہاں ہے اور اس کی ریت کہاں ہے۔ صحرا ہوا میں گم ہو جاتا ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

میری نظر میں پوری دنیا بچوں کے ایک کھیل کی طرح ہے۔ دن رات یہ غیر سنجیدہ دل بہلانے والی حرکتوں میں مشغول رہتی ہے۔ اس کی حرکتوں اور اس کے اقوال میں کوئی بہت دقیق راز چھپے ہوئے نہیں ہیں۔

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

میں دنیا کو بھی کوئی اہمیت نہیں دینا چاہتا، کیونکہ عالم کے اپنے متعلق دعوے بغیر کسی بنیاد کے ہیں۔ میرے لئے ان کی حیثیت ایک وہم کی ہے۔ ان میں اصلیت کچھ نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

غالب نے اپنے زمانے کے عالموں اور عابدوں کے بتلائے ہوئے نظریے مسترد کر دیئے۔ فرماتے ہیں:

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس زندگی کو مرنے کے بعد جنت میں جانے کی خاطر قربان کر دوں۔ یہ سودا درست نہیں ہے۔

خلد را نہادم من، لطفِ کوثر از من جوئے
کعبہ را سوادم من شورِ زمزم از من پُرس

میرا وجود خود بہشت ہے، مجھ سے کوثر کی لذتیں حاصل کر۔ میری ذات خود کعبہ ہے، مجھ سے پوچھ کہ آبِ زمزم کیا شے ہے۔

ہنگامہ دلکش است، نویدِ بخلد چیست
اندیشہ بے غش است، نیازم بہ پند نیست

دنیا کے ہنگامے دلکش ہیں، پھر جنت کی خوشخبری کے کیا معنی۔ میرے خیالات صاف اور پاکیزہ ہیں۔ میں پند ونصیحت کا نیازمند نہیں ہوں۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ہم سمجھتے ہیں کہ جنت کا تصور دل کو خوش رکھنے کے لئے ہے تو ٹھیک ہے، یہ تصور قائم بھی رکھا جائے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے جو ہمیں معلوم ہے۔ ہم اس کے اعلان کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

یا رب بہ زاہداں چہ دہی خلد رائیگاں
جورِ بتاں ندیدہ دل و خوں نکردہ کس

یا رب تو نے ان پرہیز گاروں کو جنت دی۔ یہ تو جنت کا صحیح استعمال نہ ہوا۔ جنت تو ان کے لئے ہونی چاہیے جنہوں نے حُسن کی پرستش میں جور و ستم اٹھائے ہوں، دنیا کے لعن طعن سہے ہوں، فراق کے صدمے برداشت کئے ہوں اور محبت کرنے میں دل خون خون کیا ہو۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

بہشت میں نیک کام کے بدلے اجر پانے والوں کا مجمع ہوگا۔ بہتر یہی ہوگا کہ بہشت کو دوزخ میں ڈال دیا جائے تاکہ نیک کام کرنے کے لئے شراب اور شہد کا لالچ ختم ہو جائے اور جنہوں نے نیک کام لالچ میں آکر کئے ہیں ان کو سزا ملے۔

خرابی چو پدید آمد بطاعت داد تن زاہد
خمیدن ہائے دیوار سرا گردید محرابش

جب زاہد کو اپنی زندگی میں بربادی اور تباہی کی صورت نظر آئی تو اُس نے بندگی اور اطاعت کا شیوہ اختیار کرلیا۔ ''چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی''۔ اُس کے گھر کی جھکی ہوئی دیواریں اُس کے لیے محراب کا کام دینے لگیں۔ جس نظریہ سے مفاد ملے اسے مقدس تسلیم کرلیا۔

سخن کوتہ، مرا ہم دل بہ تقویٰ مائل است اما
ز ننگِ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائی ہا

مختصر یہ کہ دوسروں کی طرح میرا دل بھی زہد و تقویٰ کی طرف مائل ہے۔ لیکن زاہد کے ناہنجار اطوار دیکھ کر میں نے کافرانہ طرزِ عمل اختیار کر لیا ہے۔ (کہ یہ غلط زاہدانہ کردار سے بہتر ہے۔)

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پا بستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

دانشور لوگ جو آج کی اقدار اور صورتِ حال کا دفاع کرتے ہیں ان کے لیے ایسا کرنا کوئی فخر و ناز کی بات نہیں ہے۔ رسم و رواج کی پابندی تو ہر کوئی کر رہا ہے۔ ان کے گن گانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہوں منحرف نہ کیوں رہِ رسم و ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط، قلمِ سر نوشت کو

اس دنیا میں میرے لئے اپنی زندگی کو ثواب کمانے کی خاطر ڈھالنا ممکن نہیں ہے۔ جیسے ٹیڑھا قط لگے قلم سے ٹھیک لکھا نہیں جا سکتا، اسی طرح میں اپنی زندگی پرانی اقدار کے حساب سے نہیں گزار سکتا۔ میرا عقیدہ نہیں ہے کہ

نیک کام کسی انعام کے عوض کیئے جائیں۔ میرے لئے راہ رسم و ثواب سے منحرف ہونا ضروری ہے۔ یہی میرا فیصلہ ہے۔ یہی میرا مستقبل ہے۔ جو ہونا ہے سو ہو۔ میری راہ الگ ہے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

میں خوب واقف ہوں کہ طاعت و زہد کے عوض ثواب ملے گا اور ثواب کے عوض جنت۔ لیکن ایسا کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا میں اپنے آپ سے مجبور ہوں۔ میں انعام کی خاطر نیک کام نہیں کرسکتا اور اجر کے لئے عبادت نہیں کرسکتا۔ نیکی تو بغیر اجر و انعام کرنی چاہیے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزاۓ ایماں ہو گئیں

لیکن مذہب اور روایت کے نام پر عمل کی جانے والی رسومات ایک مٹی ہوئی معدوم ملت کی نشانیاں ہیں۔ ہمارے عقیدہ میں ان رسومات کو ترک کرنا ضروری ہے۔ ہم موحد ہیں۔ اپنے لئے ہم خود فیصلے کرتے ہیں کہ ایمان کیا اور کفر کیا ہے، زندگی کیسے گزارنی چاہئے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

ہم تو عرش تک پہنچے ہوئے ہی ہیں۔ جو عرش سے نیچے ہیں ان کی منتہائے نظر صرف عرش تک ہے، ہم عرش سے بالا بھی دیکھ سکتے ہیں۔

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

جو دیکھا یا سنا جا سکے وہ احاطہ عقل میں آ سکتا ہے۔ ہم پر جو زمزمہ راز عیاں ہوا ہے وہ احاطہ عقل یعنی سرحدِ ادراک سے پرے ہے۔ عقل صرف منزل کی سمت کا تعین کر سکتی ہے، منزل کی طرف نہیں لے جا سکتی۔ اس لئے سمجھدار لوگ قبلہ کو قبلہ نما کہتے ہیں۔

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اٹھا واعظ
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

اے واعظ! خدا کے واسطے اپنی تلاش اپنے عقائد کی منطق کے دائرے میں رہ کر نہ کر۔ کہیں ایسا نہ ہو تو ناکام ہو جائے اور جس سے تو بچنا چاہتا ہے تیرے ہاتھ میں وہی رہ جائے۔

کعبہ میں جا رہا ہوں، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

میں کعبہ کا بار بار نام لیتا ہوں تو مجھے طعنہ نہ دو۔ میں نے اہلِ کنشت سے انا الصنم کا سبق بھی لے رکھا ہے، میں اس پر قائم ہوں، اس سبق کو بھولا نہیں ہوں۔ اہلِ کنشت (زرتشتی عقیدہ کے لوگ) اپنی عبادت گاہ میں انا الصنم (میں پتھر ہوں) کا نعرہ لگاتے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا، اور اس نعرہ پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا تھا۔

بے خطر از خودی برآ، لب بہ انا الصنم کشا
شیوہ گیرودار نیست در کنشِ کنشت ما

خودی کو بلا خوف و خطر ترک کر دے اور انا الصنم (میں صنم ہوں) کا نعرہ بلند کر۔ تیرے دل میں جو تیرا مقام ہوا کرتا تھا اسے بلا خوف و خطر فراموش کر دے۔ کہہ دے کہ تو کچھ نہیں ہے، پتھر ہے۔ ہماری عبادت گاہ کے دستور کے مطابق تجھ سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی، تو آزاد ہے۔ اپنے یقین کے مطابق جو چاہے راہ اختیار کر۔

☆ ☆ ☆

جہاں غالب اس نتیجہ پر پہنچے کہ قطرہ سے دریا کو پہچانا جا سکتا ہے اور انسان میں کائنات کے راز پنہاں ہیں اُن کا فیصلہ یہ بھی تھا کہ ''خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے''۔ جو بھی حقیقت دریافت کرو اس کا اعلان نہ کرو۔ اس کا نعرہ نہ لگاؤ۔ یہ تو ہر ایک کی انفرادی کھوج ہے۔ غالب کو منصور کی جانب سے انا الحق کا اعلان پسند نہیں آیا۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

گو ہم قطرہ ہیں لیکن ہم میں سمندر جتنا علم سمویا ہوا ہے۔ ہم اپنے رہبر

خود ہیں۔ ہمیں دوسروں پر اپنا مرتبہ جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ منصور نے انا الحق کا اعلان کر کے اپنے ظرف کے چھوٹے ہونے کا، او چھے پن کا ثبوت دیا تھا۔ ہمیں اس کی تقلید منظور نہیں ہے۔ منصور کو ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ منصور کا دعویٰ بلا ضرورت تھا۔ دعوے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے اپنے دعوے میں کامل یقین نہیں تھا۔ اسے حمایت کی ضرورت تھی۔ پھر بھی غالب منصور کو مجرم نہیں گردانتے۔ فرماتے ہیں:

در پردۂ رسوائی منصور نوائے است
رازت نہ شنودیم ازیں خلوتیاں ہیچ

یہ خلوت نشین لوگ (عالم و عابد) تو تیرے راز سے یکسر نا آشنا ہیں۔ ہم نے ان سے کوئی حکمت کی بات نہیں سنی۔ انہوں نے منصور کو سولی پر چڑھا دیا۔ ٹھیک ہے کہ منصور انا الحق کہہ کر بدنام ہوا لیکن اس کی رسوائی میں ایک نوا تو تھی۔ ایک بات تو تھی۔ اس نے ایک آواز تو بلند کی تھی۔ آپ اس سے اتفاق نہ کریں تو نہ کریں۔ وہ لائق سزا تو نہیں تھا۔

مجرم مسنج رند انا الحق سرائے را
معشوقہ خود نما و نگہباں غیور بود

رند انا الحق کو مجرم نہ سمجھو۔ اس کا کیا قصور۔ منصور پر جو راز عیاں

ہوا اس راز کو پبلک کی حمائت درکار تھی۔ راز نے منصور کو مجبور کیا کہ وہ اسے عام کر دے۔ یعنی معشوقہ خود نما تھی لیکن منصور کے نگہبان کو رشک آ گیا۔

غالب فرماتے ہیں کہ اُن کے سینے میں جو راز ہیں اُن کو کسی وعظ کی بنیاد نہیں قرار دیا جا سکتا۔

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

ہماری فکر و نظر کا راز افشا نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر لیکچر نہیں دیا جا سکتا۔ وہ وعظ نہیں ہے جو منبر پر کیا جائے۔ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ ایزد بھی محسوسات میں ہے اور عالم کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ایزد کو کس طرح محسوس کیا جا سکتا ہے اور عالم کو کس معقول طریقہ سے سمجھا سکتا ہے یہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اپنے راز افشا کرنے کے بعد زندہ رہنا نہیں چاہیں گے۔ ہمیں دار پر چڑھاؤ تو ہم اپنے راز پر گفتگو کر سکتے ہیں۔

غالب نے زندگی کی راہ سے متعلق جو کہا اُس پر انہیں بہت لعن طعن کا سامنا کرنا پڑا۔

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن، میری عریانی مجھے

۷

خاموشی سے، بغیر کسی اعلان کے ہم ایک ایک کر کے مروجہ رسومات و

اقدار کے لبادے اتار رہے ہیں۔ طاعت و زہد ہم نے چھوڑا۔ بادہ خواری ہم نے اختیار کی۔ روزہ ہم نہیں رکھتے۔ جنت کو دل خوش رکھنے کا خیال سمجھتے ہیں۔ ان اقدار کے پیروکاروں کی نظر میں ہم قابل تنقید و مذمت ہو گئے، ننگ وجود ہو گئے۔ لوگوں کی نظر میں ہم بے پیر ہو گئے۔ دنیاوی اقدار سے دوری ہماری شخصیت بن گئی ہے۔ ہم ہر طرح سے بدنام ہو گئے۔

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی
شیعی کیونکر ہو، ماوراء النہری

بعض لوگوں کو ہم سے گہری عداوت ہو گئی۔ ہم پر ''پھرے ہوئے'' ہونے کے الزام لگ گئے۔ بعض ہمیں دہریہ کہنے لگے۔ دونوں الزام غلط ہیں۔ جو صوفی ہو، وحدت کو تسلیم کرے، اسے دہریہ کیسے کہا جا سکتا ہے، اور جو ماوراء النہری یعنی ایسے علاقہ سے ہو جہاں شیعہ ہوتے ہی نہیں اسے شیعہ کہنا غلط ہے۔

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہائے شرر بار دیکھ کر

چونکہ میری فکر اور ہی ہے اور میں اس کے مطابق نالہ و فغاں کرتا ہوں

اور لوگ میرے نالہ کو کہ ''میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں پتھر ہوں۔ انا الصنم''
مجھے آتش پرست یعنی کافر کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے کلام سے سچائی کے
شرارے نکلتے ہیں۔ میں آتش بیاں ہوں۔ میرے کلام کی آتش فشانی دیکھ کر
لوگ مجھے آتش پرست گردانے لگے ہیں۔ گو ایسا ہے نہیں۔

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

میں جہاں بھی ہوں مجھے وہ جگہ راس نہیں آتی۔ اگر پھول ہوں تو
کانٹوں میں گھرا ہوا ہوں اور اگر خس و خاشاک ہوں تو میرے ارد گرد پھول
ہیں۔ نہ وہ لوگ جو نیک کہلاتے ہیں مجھ سے اتفاق کرتے ہیں اور نہ ہی جو بد
جانے جاتے ہیں میری بات سنتے ہیں۔ مجھ سے کوئی بھی متفق نہیں ہے۔

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا
مومن نہ بود غالب و کافر نتواں گفت

میں کہیں! اپنے ہوش تو نہیں کھو گیا۔ اک عجیب دیوانے سے ہمارا
واسطہ آ پڑا ہے۔ غالب مومن نہیں ہے، لیکن اسے کافر بھی نہیں کہا جا سکتا۔ پھر
وہ کیا ہے؟ دیوانہ ہے؟
لیکن کیا دیوانہ ہونا بُری بات ہے۔ دیوانہ ہوئے بغیر عشق کیسے کیا جا

سکتا ہے۔ غالب کو بُرا ضرور قرار دیں لیکن خیال رکھیں کہ دیوانہ ہے۔

کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہئے

ہم مانتے ہیں کہ غالب برا ہے۔ لیکن اس کی برائی آشفتہ سری سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اسے آشفتہ سر ہی کہنا کافی ہے۔ آشفتہ سر کو بہت کچھ معاف ہوتا ہے۔

عقل و دیں بردہ، دل و جاں نیز
آنچہ از ما نہ بردہ خبر است

تیری تلاش میں ہم عقل سے بھی گئے اور دین سے بھی۔ ہم نے اپنا دل بھی دے دیا اور جان بھی۔ البتہ جو تُو ہم سے نہیں چھین سکا وہ خبر ہے۔ ہم نے جو کھوج نکالا ہے، ہمیں جو کائنات کا علم ہوا ہے، نہ وہ عقل کے احاطہ میں ہے اور نہ دین اس کا پتہ دیتا ہے۔

ز گلفروش ننالم کز اہلِ بازار است
تپاکِ گرمیِ رفتارِ باغبانم سوخت

میں پھول بیچنے والے سے نالاں نہیں ہوں کہ وہ تو اہلِ بازار ہے۔ اس سے کیا شکوہ۔ مجھے تو باغباں کی گرمیِ رفتار کی تپش نے جلا دیا ہے۔ جو بیچنے

کے لئے پھول اگاتا ہے۔ مجھے برے کام کرنے والوں سے شکایت نہیں ہے۔ شکایت تو ان سے ہے جو برے کاموں کا مواد فراہم کرتے ہیں۔ غلط کاموں کو صحیح کاموں کی طرح پیش کرتے ہیں۔

فرماتے ہیں لوگ بلاوجہ ہمارے دشمن ہوگئے۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

ہم نے کبھی دانا ہونے کا دعوی نہیں کیا۔ ہم تو دانائی کے لئے کبھی مشہور نہیں ہوئے اور نہ اس بنا پر ہم نے کوئی سند حاصل کی۔ ہم نے تو علم کے دعووں کی بنا پر کوئی مفاد نہیں اٹھائے، کسی کی کرسی نہیں چھینی یا کسی کا وظیفہ نہیں کٹوایا، کسی کا حق نہیں مارا، ہم نے تو کسی ہنر میں مہارت حاصل نہیں کی۔ کسی ہنرمند کے مقابلہ میں بھی نہیں آئے۔ پھر لوگ ہمارے کیوں خلاف ہو گئے۔

حسد، سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجئے
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہیے

فرماتے ہیں کہ کیا کیا جائے، جو شخص سخن میں کمال حاصل کر لیتا ہے لوگ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح جو شخص کسی چیز میں مہارت حاصل کر لیتا ہے لوگ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ ہنر کی دولت پالو اور ستم اٹھانے

کے لئے تیار رہو۔

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ، شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

دوسروں کی کامیابی یا ترقی دیکھ کر حسد کرنے والوں کو غالب مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنی نگاہ کا دائرہ وسیع کریں۔ محدود دنیا کا نظارہ کرنے والا یعنی کنوئیں کا مینڈک لازمی طور پر تنگ نظر ہوتا ہے۔ یہی حال حاسد کا ہوتا ہے۔ اگر حاسد اپنے خول سے نکل کر دنیا دیکھے گا تو اس کا حسد ختم ہو جائیگا۔
بہر حال وہ کسی طرح خائف نہیں ہیں۔

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے، جس بھیس میں وہ آئے

ہمیں اپنی سوچ اور راہ سے ہٹانے والے بہت ہیں۔ کوئی ہمیں ڈراتا ہے کہ ان کی نہ مانی تو ہمارا بُرا حشر ہوگا، ہمیں قتل کر دیا جائیگا۔ کوئی ہمیں سمجھاتا ہے، لالچ دیتا ہے۔ یہ لوگ طرح طرح کے بھیس بنا کر ہمارے پاس آتے ہیں۔ لیکن ہم انہیں پہچانتے ہیں۔ ان کا مقصد ہمیں راہ سے ہٹانا ہے۔

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

لیکن ہم سب کو بتا دیں کہ ہم ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ گو ہم باہر سے کافر لگتے ہیں، اندر سے ہم ولی ہیں۔ ولی کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

غالب کو شکایت اُن افراد سے ہے جو سادہ لوح عوام کو سبز باغ دکھا کر غلط راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ رسومات ادا کرنے پر قائل کر لیتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

بہر حال غالب کے ساتھ جو بھی گزرے وہ اپنے عقیدہ کے پکے ہیں۔ وہ بلا کے خوددار ہیں۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے، در کعبہ اگر وا نہ ہوا

دنیا میں رہنے کے باوجود ہم ایسی منزل کی جانب نہیں جائیں گے جہاں ہماری آزادی یا خودداری کو ٹھیس پہنچنے کا احتمال ہو۔ یہاں تک کہ جس کی غلامی یا پرستش کریں اس کا در بھی ہمارے لئے کھلا ہونا چاہئے۔ ہمیں کسی در پر دستک دینا منظور نہیں ہے۔ بوسہ اور شراب تجھے مرغوب ضرور ہونگے۔ لیکن لینے کے عوض اگر صحیح قیمت ادا نہ کی جائے تو تیری غیرت کو ٹھیس پہنچے گی۔

تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گماں چین پیشانی مرا

میں کتنا ہی پیاسا ہوں لیکن اگر مجھے شبہ ہو جائے کہ دریا نہیں چاہتا کہ میں اس سے پانی پیوں، دریا کی لہریں اس کے ماتھے پر شکن ہیں تو میں اس کے پانی سے حلق تر نہ کروں، خواہ پیاسا ہی مر جاؤں۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

آدمی اور انسان جدا جدا ہیں۔ ہر کس و ناکس آدمی ہوتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس میں انسانیت بھی ہو۔ آدمی کا انسان بننا لگتا تو آسان ہے لیکن یہ کام آسان نہیں ہوتا۔ بہت دشوار ہوتا ہے۔

دل و دین نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر، متاعِ دستِ گرداں ہے

کائنات کے راز پانے کے لئے دل و دین نقد پیش کرنے پڑتے ہیں۔ انا الصنم یعنی ''میں کچھ بھی نہیں ہوں'' کا نعرہ لگانا پڑتا ہے۔ اپنے آپ سے آنکھیں بند کرنی پڑتی ہیں۔

فرماتے ہیں کہ نئے افکار اور نئی شخصیت سے لیس ہونے کا سودا نقد ہوتا ہے۔ یعنی جب تک پرانے عقائد اور اقدار ترک نہ کئے جائیں نئے عقائد اور اقدار اُن کی جگہ نہیں لے سکتے۔

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

جب تک میں دنیا میں رہا، دین والے بھی اور دنیا والے بھی میری کسی رائے سے متفق نہیں ہوئے۔ میں ان کے کسی معیار اور اقدار پر پورا نہیں اترا۔ انہوں نے مجھ میں ہر طرح کی برائی دیکھی۔ مجھے کسی لحاظ سے بھی اچھا نہ جانا۔ مجھ میں ہر طرح کے عیب نکالے۔ ان کے لئے میں ننگ وجود بن گیا۔ انسانیت پر ایک کلنک کا ٹیکہ۔

میرے مرنے کے بعد جب مجھے کفن پہنایا گیا تو ان کے لئے کچھ باعث اطمینان ہوا۔ کم از کم میری جسمانی برہنگی تو چھپ گئی۔

غالب، کائنات میں انسان کا مقام

--------- مجھے یہ تو معلوم تھا کہ ڈاکٹر مبشر حسن بھی غالب پر فریفتہ ہیں، لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ غالب کے مزاج شناس اور رازداں بھی ہیں۔ شاید غالب شناسی انہیں حالی سے ورثے میں ملی ہے۔------ جس ایک بات نے فکر و نظر کے حامل لوگوں کو نادانستہ طور پر ہر دور میں غالب کا گرویدہ بنائے رکھا ڈاکٹر مبشر حسن نے غالب کے اردو اور فارسی کلام میں غوطہ زن ہو کر اسے ڈھونڈ نکالا ہے۔---- اور یوں دنیائے ادب میں بھی ایک انقلابی معرکہ سر کر ڈالا ہے۔

محمد حنیف رامے

ڈاکٹر مبشر حسن اپنے ممدوح کی طرح ایک زوال پذیر معاشرے کے بحران سے نمٹنے کی خواہش رکھتے ہیں۔--- اگر سارے نظام کا مرکزی کردار انسان کو مان لیا جائے اور اسے ہوائے سر رہگزار کی مدد سے راستہ بنانے کی مہلت دی جائے تو وہ اپنا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے اپنے پندار کے صنم کدہ کو ویراں کر کے کوچہء ملامت میں آنا پڑیگا۔------ ڈاکٹر مبشر حسن تو خاصے عرصہ سے کوئے ملامت کا طواف کر رہے ہیں۔ غالب کے اشعار کی کہانی انہوں نے دوسرے شرفاء کو اس حسین کوچہ میں کھینچنے کے لئے بیان کی ہے۔

آئی۔ اے۔ رحمان

ڈاکٹر مبشر حسن پاکستان کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ایک عرصہ انہوں نے غریب اور پسماندہ طبقوں کی جدوجہد میں حصہ لیا اور ہر مارشل لاء ڈکٹیٹر نے انہیں جیل بھیجا ہے۔ وہ متعدد کتابوں اور پمفلٹوں کے مصنف ہیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں شاہراہ انقلاب، رزم زندگی The Mirage of Power اور The Birds of Indus ہیں۔ مشہور ناول نگار اور دانشور شوکت صدیقی ڈاکٹر مبشر حسن کے فن تحریر کے متعلق لکھتے ہیں ''خیال الفاظ کی بیساکھیوں کے سہارے آگے نہیں بڑھتا بلکہ الفاظ خیال کی تخلیق اور تعمیر میں چونے اور گارے کا کام دیتے ہیں۔ یہ انقلابی خیال کا انقلابی سفر ہے۔''

گذشتہ چار دہائی میں ڈاکٹر مبشر حسن کی سرگرمیاں انجینئرنگ' اقتصادی منصوبہ بندی' معاشی پالیسی' سیاست' انسانی حقوق' پاکستان و ہندوستان کے درمیان امن کا فروغ' رسالوں کی اشاعت اور پرندوں کی فوٹوگرافی پر مشتمل رہی ہیں۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے وزیر خزانہ اور پاکستان پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل بھی رہے ہیں۔ ڈاکٹر مبشر حسن 1922 میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ پانی پت اور لاہور میں تعلیم پائی۔ امریکہ سے ایم۔ ایس سی اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔